امراؤ جان ادا
مرزا ہادی رسوا

ہنس کے کہتا ہے مصور سے وہ غارت گر ہوش
جیسی صورت ہے مری ویسی ہی تصویر بھی ہو

تمہید

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن اب تمہید ذکر درد و ماتم ہو گئیں

ناظرین! شان نزول اس قصے کی یہ ہے کہ دس بارہ برس کا ذکر ہے، میرے ایک دوست منشی احمد حسن صاحب اطراف دہلی کے رہنے والے بہ طریق سیر و سیاحت لکھنو تشریف لائے تھے۔ انہوں نے چوک میں سید حسین کے پھاٹک کے پاس ایک کمرہ کرائے پر لیا تھا۔ یہاں اکثر احباب سر شام آ بیٹھتے تھے۔ بہت ہی لطف کی صحبت ہوتی تھی۔ منشی صاحب کا مذاق شعر فہمی اعلیٰ درجے کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے اور اچھا کہتے تھے، لیکن زیادہ تر ان کو سننے کا شوق تھا اس لیے اکثر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسی کمرے کے برابر ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ نہ کبھی کسی نے کمرے پر سر راہ بیٹھے دیکھا نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں میں دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا دروازہ بالکل مقفل رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا اسی سے نوکر چاکر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرے میں ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی، مگر اس میں کڑا پڑا ہوا تھا۔ ایک دن حسب معمول احباب کا جلسہ تھا۔ کوئی غزل پڑھ رہا تھا احباب داد دے رہے تھے۔ اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ وا کی آواز آئی۔ میں چپ ہو گیا، اور احباب بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ منشی احمد حسن نے پکار کے کہا: "غائبانہ تعریف ٹھیک نہیں، اگر شوق شعر و سخن ہے تو جلسے میں تشریف لائیے۔" اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر غزل پڑھنے لگا بات رفت گزشت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مہری آئی۔ اس نے پہلے سب کو سلام کیا، پھر یہ کہا: "مرزا رسوا کون صاحب ہیں؟" احباب نے

مجھے بتا دیا۔ مہری نے کہا "بیوی نے ذرا آپ کو بلایا ہے۔" "میں نے کہا "کون بیوی؟" مہری نے کہا "بیوی نے کہہ دیا ہے نام نہ بتانا آگے جو آپ کا حکم ہو۔" مجھے مہری کے ساتھ جانے میں تامل ہوا۔ احباب مجھ سے مذاق کرنے لگے، "ہاں صاحب! جاتے کیوں نہیں، کبھی کی صاحب سلامت ہے جب تو اس طرح بلا بھیجا۔" میں دل میں غور کر رہا تھا کون صاحب ایسی بے تکلف ہیں۔ ادھر مہری نے کہا، "حضور! بیوی آپ کو اچھی طرح جانتی ہیں، جب تو بلا بھیجا۔" آخر جانا ہی پڑا۔ جا کے جو دیکھا، معلوم ہوا، آہ ہا! امراؤ جان صاحب تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان:۔ (دیکھتے ہی) اللہ! مرزا صاحب! آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔

میں:۔ یہ معلوم کسے تھا کہ آپ کس کوہ قاف میں رہتی ہیں؟

امراؤ جان:۔ یوں تو میں اکثر آپ کی آواز سنا کرتی تھی مگر کبھی بلانے کی جرات نہ ہوئی۔ آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا۔ بے ساختہ منہ سے واہ دا نکل گیا۔ ادھر کسی صاحب نے کہا۔ "یہاں آئیے۔" میں اپنی جگہ پر آپ ہی شرمندہ ہوئی۔ جی میں آیا چپ رہوں، مگر پھر دل نہ مانا۔ آخر اگلی خصوصیتوں کے لحاظ سے آپ کو تکلیف دی۔ معاف کیجیے گا۔ ہاں وہ شعر ذرا پھر پڑھ دیجیے۔

میں:۔ معاف تو کچھ بھی نہیں ہوگا اور نہ میں شعر سناؤں گا۔ اگر آپ کو شوق ہے تو وہیں تشریف لے چلیے۔

امراؤ جان:۔ مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں، مگر یہ خیال ہے کہ صاحب خانہ یا اور کسی صاحب کو میرا جانا ناگوار نہ ہو۔

میں:۔ آپ کے حواس درست ہیں! بھلا ایسی جگہ میں آپ کو چلنے کے لیے کیوں کہتا؟ بے تکلف صحبت ہے، آپ کے جانے سے اور لطف ہوگا۔

امراؤ جان:۔ یہ تو سچ ہے، مگر کہیں زیادہ بے تکلفی نہ ہو؟

میں:۔ جی نہیں، وہاں میرے سوا کوئی آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتا۔

امراؤ جان:۔ اچھا تو کل آؤں گی۔

میں:۔ ابھی کیوں نہیں چلتیں؟

امراؤ جان:۔ اے ہے، ابھی؟ دیکھیے تو کس حیثیت سے بیٹھی ہوں!

میں:۔ وہاں کوئی مجرا تو ہے نہیں، بے تکلف صحبت ہے، چلی چلیے۔

امراؤ جان:۔ اوئی مرزا! آپ کی تو باتیں لاجواب ہوتی ہیں، اچھا چلیے میں آتی ہوں۔

میں اٹھ کے چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد امراؤ جان صاحب ذرا کنگھی دنگھی کر کے کپڑے بدل کے آئیں۔

میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مزاق شعر و سخن اور کمال موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی، لوگ مشتاق ہو گئے تھے۔ جب وہ تشریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں۔ خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ اس دن سے امراؤ جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ نشست رہتی تھی۔ کبھی شعر و شاعری کا جلسہ ہوا، کبھی انہوں نے کچھ گایا، احباب محظوظ ہوئے۔ ایسے ہی ایک جلسے کی کیفیت ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ ان مشاعروں میں نہ کوئی طرح مقرر کی جاتی تھی اور نہ بہت سے لوگوں سے وعدے لیے جاتے تھے۔ صرف بے تکلف احباب جمع ہو جاتے تھے اور اپنی اپنی تازہ تصنیف غزلیں پڑھتے تھے۔

مشاعرہ

کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا رسوا:۔ کیا کہنا ہی امراؤ جان صاحب! یہ مقطع تو آپ نے حسب حال کہا ہے۔ اور شعر کیوں نہ پڑھے؟

امراؤ جان:۔ تسلیم مرزا صاحب! آپ کے سر کی قسم بس وہ مطلع یاد تھا اور یہ مقطع۔ خدا جانے کس زمانے کی غزل ہے۔ زبانی کہاں تک یاد رہے، بیاض نگوڑی گم ہو گئی۔

منشی صاحب:۔ اور وہ مطلع کیا تھا؟ ہم نے نہیں سنا۔

رسوا:۔ آپ تو اہتمام میں مصروف ہیں، سنے کون؟

اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے جلسے کے لیے بڑے سلیقے سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے سے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد ہو جائے۔ اسی پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آب خورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہانڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ نے حقوں

کے نیچے میں پانی چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے۔ چاندنی رات تھی، اس لیے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک سفید کنول دورے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب، خان صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب، وغیرہ وغیرہ تشریف لائے۔ پہلے شیر فالودے کے ایک ایک پیالے کا دور چلا، پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

منشی صاحب:۔ تو پھر اہتمام آپ کیجیے، بندہ شعر سنے۔

رسوا:۔ معاف فرمائیے، یہ دردِ سر مجھ سے نہ ہو گا۔

منشی صاحب:۔ اچھا وہ مطلع کیا تھا؟

امراؤ:۔ میں عرض کیے دیتی ہوں:

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا، مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب:۔ خوب کہا ہے!

خان صاحب:۔ اچھا مطلع کہا ہے، مگر یہ "بھول گیا" کیوں؟

امراؤ جان:۔ تو کیا خان صاحب میں ریختی کہتی ہوں؟

خان صاحب:۔ مزا تو ریختی کا ہے۔ "میرے مولا نے خیر کی" آپ ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔

رسوا:۔ بس آپ کے حملے شروع ہو گئے، لے شعر سنتے دیکھیے۔ خان صاحب! دنیا میں اگر سب آپ ہی کے سے محقق ہو جائیں تو شعر گوئی کا مزا تشریف لے جائے!

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

خان صاحب:۔ (کسی قدر برے تیوروں سے) درست۔

رسوا:۔ امراؤ جان، اچھا تو کوئی اور غزل پڑھو!

امراؤ جان:۔ دیکھیے کچھ آئے تو عرض کروں۔

(تھوڑی دیر کے بعد)

شب فرقت بسر نہیں ہوتی
نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

حضار جلسہ:۔ واہ وا! سبحان اللہ! کیا کہنا!

امراؤ جان:۔ (تسلیمیں کر کے) یہ شعر ملاحظہ ہو:

شور فریاد تا فلک پہنچا
مگر اس کو خبر نہیں ہوتی

رسوا:۔ کیا شعر کہا ہے! (حضار نے بھی تعریف کی)

امراؤ جان:۔ آپ کی عنایت ہے تسلیم، تسلیم!

تیرے کوچے کے بے نواؤں کو
ہوس مال و زر نہیں ہوتی

احباب:۔ تعریف

امراؤ:۔ تسلیم!

امراؤ جان:۔

جان دینا کسی پہ لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

رسوا:۔ واہ! خان صاحب یہ شعر ملاحظہ ہو۔

خان صاحب:۔ سبحان اللہ! حقیقت میں کیا شعر کہا ہے!

امراؤ جان:۔ (تسلیم) آپ سب صاحب قدر افزائی فرماتے ہیں۔

ع : ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

ہے یقیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی
کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی

خان صاحب:۔ یہ بھی خوب کہا!

پنڈت صاحب:۔ کیا طرزِ کلام ہے!

امراؤ:۔ (تسلیم کر کے)

اب کس امید پر نظر میری
شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی

خان صاحب:۔ کیا اچھا کہا ہے! فارسیت ٹپک رہی ہے۔

منشی صاحب:۔ جو کچھ ہو، مضمون اچھا ہے۔

امراؤ:۔ تسلیم!

ہم اسیران عشق کو، صیاد
ہوس بال و پر نہیں ہوتی

احباب:۔ تعریف

امراؤ:۔ تسلیم!

غلط انداز ہی سہی، وہ نظر
کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

خان صاحب:۔ ہاں ہونا تو چاہیئے۔ خوب کہا ہے!

امراؤ:۔ تسلیم! مقطع ملاحظہ ہو:

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

خان صاحب:۔ کیا مقطع کہا ہے! یہ آپ اپنا تجربہ بیان کرتی ہیں؟ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہے۔

امراؤ:۔ ذاتی تجربہ جو کچھ ہو، میں نے تو ایک شاعرانہ مضمون کہا ہے۔

رسوا:۔ اچھا، ذرا پھر تو پڑھیے۔

امراؤ جان نے پھر پڑھا۔

رسوا:۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے دونوں پہلو اس شعر سے نکلتے ہیں۔

خان صاحب:۔ واقعی مرزا صاحب کیا بات کہی!

احباب:۔ غزل از مطلع تا مقطع ایک رنگ میں ہے۔ اعلیٰ درجے کا مذاق ہے!

آغا صاحب:۔ نشست الفاظ تو ملاحظہ کیجیے!

پنڈت صاحب:۔ کیا درخشانی کی ہے!

امراؤ جان:۔ (کھڑی ہو کے) "تسلیم!"

منشی صاحب:۔ خان صاحب، اب آپ کچھ ارشاد کیجیے۔

خان صاحب:۔ حضرت! مجھے تو معاف کیجیے، کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

رسوا:۔ کچھ تو پڑھیے۔

خان صاحب نے ایک مطلع اور دو شعر پڑھے:

حیف بنت العنب نہیں ملتی
ماہ میں ایک شب نہیں ملتی

رسوا:۔ کیا اچھا کنایہ ہے، یعنی شب چار دہم۔

خان صاحب:۔ تسلیم!

یوں تو ملتی ہے داد صنعت شعر
داد حسن طلب نہیں ملتی

خان صاحب:۔ تسلیم!

رسوا:۔ کیا کہنا! خوب فرمایا!

شوخیوں سے کسی کی، میری مراد
پہلے ملتی تھی، اب نہیں ملتی

رسوا:۔ لاجواب شعر کہا ہے۔

خان صاحب:۔ تسلیم!

اس کے بعد ایک صاحب تشریف لائے۔ آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔

خان صاحب:۔ یہ کون صاحب آتے ہیں؟ شب ماہ میں لالٹین کی کیا ضرورت تھی؟

نواب صاحب:۔ حضرت حماقت تو ہوئی، معاف کیجیے گا۔

خان صاحب:۔ اخاہ نواب صاحب! یہ حضور مضائقہ ندارد۔

نواب صاحب تشریف لائے، سب نے تعظیم کی۔ غزل پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔

نواب صاحب:۔ میں تو آپ صاحبوں کا مشتاق ہو کے آیا ہوں، مجھے تو کچھ یاد داد نہیں۔

شیخ صاحب:۔ جناب غزل پڑھنا ہوگی۔

ب صاحب:۔ اچھا جو کچھ یاد آتا ہے، عرض کیے دیتا ہوں

دل میں کھب جائے گی قاتل کی ادا ایک نہ ایک
کارگر ہو گا کبھی تیر قضا ایک نہ ایک

احباب:۔ سبحان اللہ! واہ وا! کیا مطلع فرمایا ہے۔

نواب صاحب:۔ (جھک جھک کے تسلیمیں کرنے لگے) شعر ملاحظہ ہو:

کوئی حوروں پہ فدا، کوئی بتوں پر شیدا

ڈھونڈ ہی لیتے ہیں انساں، خدا ایک نہ ایک

احباب:۔ واہ! کیا شعر کہا ہے!

نواب صاحب:۔ تسلیم (اس کے بعد چپ ہو رہے)۔

رسوا:۔ اور کچھ ارشاد ہو۔

نواب صاحب:۔ واللہ! اب کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

منشی صاحب:۔ پنڈت صاحب! اب آپ داد فصاحت دیجیے۔

پنڈت جی:۔ امتثالاً للکلام دو تین شعر عرض کیے دیتا ہوں:

وصل میں ذکر عدو بھی دم بہ دم ہوتا رہا
شربت دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا

احباب:۔ تعریف

پنڈت جی:۔

زاہدا! دو دن سے چرچا حق پرستی کا ہوا
ورنہ کعبے میں سدا ذکر صنم ہوتا رہا

نواب صاحب:۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے، مگر خوب کہا ہے!

پنڈت صاحب:۔ کہیے یا نہ کہیے، مگر بات سچی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

واقعا! کیوں سر جھکائے وہ کسی کے روبرو
جس کا سر نقش قدم پر اس کے خم ہوتا رہا

احباب:۔ تعریف

پنڈت جی:۔

زلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دیے
مو بہ مو حال پریشانی رقم ہوتا رہا

رسوا:۔ یہ خاص لکھنؤ کا مذاق ہے۔

پنڈت جی:۔ اور آپ دہلی کے کب ہیں؟

رسوا:۔ اچھا شعر پڑھیے، میں نے تو ایک بات کہی۔

پنڈت جی:۔

دل جو تھا پہلے گل نورستۂ باغ مراد
خار خار حسرت رنج و الم ہوتا رہا

نواب صاحب:۔ دیکھیے کیا شعر کہا ہے!

خان صاحب:۔ متانت الفاظ ملاحظہ ہو!

پنڈت جی:۔ تسلیم! مقطع ملاحظہ ہو:

شکریہ مخمور اس کا کب ادا تجھ سے ہوا
ہر نفس تجھ پر جو خالق کا کرم ہوتا رہا

خان صاحب:۔ سبحان اللہ! ہر نفسے کہ فرو می رود ممد حیات است و چوں بر می آید مفرح ذات۔

رسوا:۔ خان صاحب! آپ کے مارے تو شعر ہی پڑھنا مشکل ہے۔

احباب:۔ سبحان اللہ، کیا غزل فرمائی ہے!

پنڈت جی:۔ آپ کی عنایت، پرورش، بندہ نوازی۔ واللہ! یہ آپ ہی لوگوں کا صدقہ ہے۔

منشی صاحب:۔ شیخ صاحب! آپ بھی تو کچھ ارشاد کیجیے۔

شیخ صاحب:۔ (مسکرا کر) جی مجھے تو کچھ یاد نہیں۔

خان صاحب:۔ یاد نہیں، مگر ستر شعر کی غزل جیب میں ہوگی۔

شیخ صاحب:۔ واللہ نہیں، صرف چار شعر ابھی موزوں کر لیے ہیں۔

رسوا:۔ تو پھر پڑھتے کیوں نہیں!

شیخ صاحب:۔ عرض کیے دیتا ہوں۔

عرض وہ عرض ہے جس میں کوئی اصرار نہ ہو
بات وہ بات کہ جس بات سے انکار نہ ہو

احباب:۔ تعریف

شیخ صاحب:۔ تسلیم!

مثل یوسف سر بازار پڑے پھرتے ہو
کیا ہی شرماؤ اگر کوئی خریدار نہ ہو

رسوا:۔ کیا اچھا مذاق ہے!

شیخ صاحب:۔ تسلیم

دل وہ اچھا جو حسینوں کی نظر میں نہ جچے
جنس وہ خوب، کوئی جس کا خریدار نہ ہو

خان صاحب:۔ بہت خوب!
شیخ صاحب:۔ تسلیم

قتل عشاق کی بے کار قسم کھاتے ہو
ہم نہ مانیں گے اگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو

استے میں ایک آدمی آیا اور اس نے ایک پرچہ منشی احمد حسن کو دیا

منشی صاحب:۔ (رقعہ پڑھ کے) لیجیے، مرزا صاحب تشریف نہیں لائیں گے، غزل تازہ تصنیف بھیج دی ہے۔

میں نے آدمی سے پوچھا "کرتے کیا ہیں؟"

آدمی:۔ (مسکرا کے) جی حضور سکندر باغ سے سرِ شام بہت سے انگریزی درختوں کے نالدے لے کے آئے ہیں۔ ان کو گول حوض کے کنارے پتھروں کے اندر سجا رہے ہیں۔ مالی پانی دیتا جاتا ہے۔

رسوا:۔ جی ہاں، انہیں اپنے اعمال سے فرصت کہاں جو مشاعرے میں تشریف لائیں۔

منشی صاحب:۔ واللہ کیا صحبت کو بے لطیف کیا ہے۔ نہ آئے نا، اچھا غزل ہی پڑھ دیجیے۔

رسوا:۔ مجھ سے تو کچھ نہ پڑھوایئے گا؟

منشی صاحب:۔ ہاں خوب یاد آیا، اچھا تو پہلے آپ پڑھ لیجیے۔

رسوا:۔

نہ پوچھو ہم سے کیوں کر زندگی کے دن گزرتے ہیں
کسی بے درد کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
کوئی ان سے کہے دل لے کے بھی یوں ہی مکر جانا
عدو کے سامنے جو گالیاں دے کر مکرتے ہیں
ابھی تو ہنس رہے ہیں مدعی ذوقِ جراحت پر
نہ پوچھو اس مزے کو جب نمک زخموں میں بھرتے ہیں
تماشا ہو جو ان کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں

بہت جو چاہنے والوں کا دل لے کر مکرتے ہیں
انہی کا نام لے لے کر کوئی فرقت میں مرتا ہے
کبھی تو وہ بھی سن لیں گے جو بدنامی سے ڈرتے ہیں
بگاڑا ہم کو قسمت نے تو پھر بنتا نہیں ممکن
وہ گیسو ہیں کسی کے جو بگڑ کے پھر سنورتے ہیں
کبھی شانے سے الجھے وہ کبھی آئینے کو توڑا
سنورنے میں بگڑتے ہیں، بگڑنے میں سنورتے ہیں
ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جوبن کی
دوپٹہ اوڑھ کر آڑا جو چلنے میں ابھرتے ہیں
ادا سے ناز کو رسوا ہے دعویٰ پارسائی کا
کوئی پوچھے تو آخر مرنے والے کس پہ مرتے ہیں

احباب نے ہر شعر کی داد دی۔ رسوا نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب کی غزل پڑھنا شروع کی:

کل رات کو انہیں جو کہیں دیر ہو گئی
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی
مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی
بیہودہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں
ان موذیوں سے عقل اگر زیر ہو گئی
اے موت! تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا سے آ
ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی
میری تباہیوں کی تمہیں اب خبر ہوئی
کیا پوچھتے ہو عمر یوں ہی تیر ہو گئی
آج ان سے ہم نے آنے کا وعدہ کیا تو بس
دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی

ٹلنا تھا میرے پاس سے اے کاہلی تجھے
کم بخت تو تو آ کے یہیں ڈھیر ہو گئی
دبکی ہوئی تھی گربہ صفت خواہش گناہ
چمکارنے سے پھول گئی، شیر ہو گئی
مرزا مشاعرے میں نہ تشریف لائیں گے
تا چند انتظار؟ بڑی دیر ہو گئی

اس کے بعد مظہرالحق نامی ایک شاعر، کہیں باہر کے رہنے والے، جو اس وقت اتفاق سے وارد مشاعرہ تھے، انہوں نے یہ نظم پڑھی:

ہے ہمارے مشاعروں کا یہ حال
جن کی اب نقل کرتے ہیں نقال
روش اہل فن پہ ہنستے ہیں
رنگ بزم سخن پہ ہنستے ہیں
کیا زمانے میں غدر ہے توبہ
شاعری کی یہ قدر ہے توبہ
گو کہ پاس ادب نہیں کرتے
جو کچھ بے سبب نہیں کرتے
چلتے ہیں شاعران خوش تقریر
اپنے ہمراہ لے کے جم غفیر
کب سخن در اکیلے جاتے ہیں
قدر دانوں کو لے کے آتے ہیں
جاتے ہیں معرکوں میں فوج سمیت
ساتھ ہوتے ہیں بے شمار پھندیت
جن کے ہم راہ یہ ہجوم نہ ہو
کبھی ان کی غزل کی دھوم نہ ہو
اک ادھر واہ واہ کرتا ہے

اک ادھر آہ آہ کرتا ہے
واہ کیا طرز درفشانی ہے
واہ کیا وضع خوش بیانی ہے
کوئی کہتا ہے "واہ کیا کہنا
فی الحقیقت ہے یہ نیا کہنا
اس سے بہتر کہے گا کیا کوئی
کب ہے استاد آپ سا کوئی
اس زمانے میں آپ یکتا ہیں
واقعی فخر میر و مرزا ہیں
کب میسر تھا ان کو حسن کلام
کچھ نہ تھے وہ، فقط ہے نام ہی نام
ان کے دیواں میں کب یہ نشتر ہیں
بخدا! آپ ان سے بہتر ہیں
ان سے واللہ! آپ اچھے ہیں
ثم باللہ! آپ اچھے ہیں
کہیں بڑھ کر ہے آپ کا انداز
نکتہ سنجی ہے یا کہ ہے اعجاز
آپ قدرت نمائے معنی ہیں
فی الحقیقت خدائے معنی ہیں
آپ کے آگے کون منہ کھولے
کس کا مقدور ہے جو کچھ بولے
ہے یہ انداز آپ کا حصہ
ہے یہ اعجاز آپ کا حصہ
دل میں ہم خوب کر چکے ہیں غور
آپ ہی آپ ہیں، نہیں کچھ اور

آپ ایسے ہیں، آپ ویسے ہیں
ہم سمجھتے ہیں آپ جیسے ہیں
آپ کیا قدر اپنی پہچانیں
پوچھیے ہم سے، آپ کیا جانیں
آپ کا کام ہے ہوا بندی
آپ پر ختم ہے ادا بندی
ایسے شاعر ہوئے تھے کب پیدا
نہ ہوئے تھے نہ ہوں گے اب پیدا
الغرض بے تکی اڑاتے ہیں
بچھے جاتے ہیں، لوٹے جاتے ہیں
ان کی تعریف ہے وہ لا طائل
جس سے دکھتا ہے دوسروں کا دل
منہ سے وہ شعر ادھر نکالتے ہیں
یہ ادھر ٹوپیاں اچھالتے ہیں
جن کی تعریف کا تھا یہ مذکور
اپنے دل میں بہت ہی ہیں مسرور
اگر اس میں کسی کو غصہ آئے
کچھ تعجب نہیں کہ لٹھ چل جائے
نہیں یہ بات کچھ تعجب کی
بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی
پڑھتے ہیں لفظ لفظ رک رک کے
ہو رہے ہیں سلام جھک جھک کے
گو بہ ظاہر ہے انکسار بہت
دل میں ہے جوش افتخار بہت
کس قدر تنتے ہیں برتے ہیں

خود بھی تعریف اپنی کرتے ہیں
ہوتی ہے لفظ لفظ کی تشریح
ہوتی ہے بات بات کی تصریح
کیوں نہ ہوں اپنی مدح کے شائق
جانتے ہیں کہ ہم ہیں اس لائق
کس قدر دور ہیں معاذ اللہ !
کیسے مغرور ہیں معاذ اللہ !
نکتہ فہم ایسے، نکتہ داں ایسے
شاعر ایسے ہیں، قدر داں ایسے
جھوٹی تعریف کی حقیقت کیا
جب حقیقت نہ ہو تو لذت کیا
اس میں کیا حظ ہے یہ مزا کیا ہے
کوئی پوچھے انہیں ہوا کیا ہے
گو کہ میری مذمتیں ہوں گی
میں سمجھتا ہوں جو گتیں ہوں گی
صاف گوئی کی داد پاؤں گا
میں بھی اپنی مراد پاؤں گا
کیا غرض ہے جو میں کسی سے ڈروں
بات سچی ہے کیوں نہ کہہ گزروں
مجھ کو بھاتی نہیں لگی لپٹی
بلکہ آتی نہیں لگی لپٹی
طرز اہل سخن سے ناخوش ہوں
روش اہل فن سے ناخوش ہوں
شاعری ہے اگر اسی کا نام
دور سے ایسی شاعری کو سلام

اس نظم کی انصاف پسند احباب نے بڑی تعریف کی۔ ہر شعر پر اہل محفل تعریف کرتے جاتے تھے۔ منشی صاحب پر وجد کا عالم طاری تھا، امراؤ جان جھوم رہی تھیں۔ اور میرا جو حال تھا وہ میرے ہی دل سے کوئی پوچھے۔

منشی صاحب:۔ ہاں جناب آغا صاحب! اب آپ کچھ عنایت فرمائیے۔

آغا صاحب:۔ بہت خوب! مطلع اول ملاحظہ ہو۔

کہیں سامان ایسے ہوں تو کچھ دل کو مرے کل ہو
منڈ اپلے ہوئے ہوں اور اک مُحرے کی بوتل ہو

احباب:۔ آغا صاحب، کیا مقطع فرمایا ہے!

آغا صاحب:۔ اے حضت! ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے، دوسرا مطلع سنیے۔

وہ مضموں ڈھونڈ کر باندھوں کہ جو اشکل سے اشکل ہو
کہوں وہ مطلع ثانی کہ جو اول سے اول ہو

احباب:۔ بے شک، اول سے اول ہے۔

آغا صاحب:۔ لے اب شعر ملاحظہ ہوں:

(اس شعر کا رخ نواب صاحب کی طرف تھا، جو جالی کا کرتہ ہلکا بادامی رنگا اور باریک ململ کا انگرکھا پہنے، بند کھولے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک نہایت نفیس پنکھیا ہاتھ میں تھی، اسے جھلتے جاتے تھے)۔

اگر جاڑے میں تو مل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا
تری زلفیں ہوں شانے پر دوشالہ ہو نہ کمل ہو

احباب:۔ تعریف۔

آغا صاحب:۔

کہو بے چارگی میں بھی طبیعت خوش رکھے مجنوں
کہ چر لے ناقۂ لیلیٰ ہری جب دل کی کونپل ہو

پنڈت جی:۔ سبحان اللہ! ادر تو اور یہ بے چارگی سے کیا چارہ نکالا ہے!

احباب:۔ واللہ سمجھے بھی خوب! سمجھ ہو تو ایسی ہو، نہیں تو نہ ہو۔

آغا صاحب:۔ نہ ہو! اچھا اب یہ شعر سنیے:

کہو عشاق سے اپنے کہ ضبط گریہ فرمائیں

رکے گا راستہ گھر کا، اگر کوچے میں دلدل ہو

شیخ صاحب:۔ اچھی کہی!

رسوا:۔ (خان صاحب سے) آپ کیوں سکوت میں ہیں، کوئی اعتراض نکالیے؟

آغا صاحب:۔ ہاں جناب! سکوت قدر شناس ٹھیک نہیں ہے۔

خان صاحب:۔ آپ میری تعریف کو تحسین ناشناس نہ سمجھیے؟ اس لیے چپ ہوں۔

آغا صاحب:۔ نہیں حضرت، میری ایسی الٹی سمجھ نہیں ہے۔ احباب اس فقرے پر لوٹ گئے۔

آغا صاحب:۔ ملاحظہ ہو

ہمیں رشک آئے اپنے سے ہمیں سے غیر پیدا ہو
ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو

احباب:۔ آغا صاحب! سبحان اللہ! کیا نازک خیالی ہے۔

آغا صاحب:۔

ابھی کم سن ہیں، ان کو شوق ہے لنگڑ لڑانے کا
تکلا ڈور کا ہو اک، نہ کنکیا نہ تکل ہو

اس شعر کا رخ بھی نواب صاحب کی جانب تھا، اس لیے کہ آپ ہی کی سرکار عالی جاہ سے کنکوے کی برات بڑی دھوم سے نکلی تھی۔

آغا صاحب:۔

کوئی ان سے کہے جو شعر معنی بند کہتے ہیں
کھلے کیا راز سر بستہ جو دروازہ مقفل ہو

رسوا:۔ آغا صاحب! کیا کہنا! امراؤ جان! ذرا سننا، کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ جان:۔ سبحان اللہ! میں پہلے ہی سمجھ گئی۔ جو چاہیں کہیں، مالک ہیں۔

آغا صاحب:۔ تو صاحب کیوں نہیں کہتیں کہ دوزخ کا دربان ہوں۔ اچھا سنیے۔

کسی صورت سے بہلائیں گے اس معشوق کم سن کو
ڈبل پیسہ نہ ہو، ریوڑی نہ ہو تو گول گپل ہو

احباب:۔ کیا کہنا!

آغا صاحب:۔

کبھی گالی سنا بیٹھے، کبھی جوتے لگا بیٹھے
حکومت کا مزا آئے اگر معشوق ارذل ہو

خان صاحب:۔ درست، مگر آپ کی شرافت سے بعید ہے۔

آغا صاحب:۔ جناب شریف کون ہے اس زمانے میں۔

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا
نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو نہ تم سی کوئی شفتل ہو

نواب صاحب:۔ خوب! مگر روئے سخن کس کی طرف ہے؟

آغا صاحب:۔ یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں، اس لیے کہ آپ محرم راز ہیں۔ السر عند کرام الناس مکتوم۔

خان صاحب:۔ آپ جواب دیجیے۔

آغا صاحب:۔ آپ کیا جواب دیں گے۔ یہ شعر سنیے۔

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں
شتر کے جس میں غمزے ہوں، فرس کی جس میں چھلبل ہو

احباب:۔ واہ ری ہمت!

آغا صاحب:۔ اچھا نہ سہی، یہ سنیے۔

میں دل کو چیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اٹھ جاؤ
میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے اوجھل ہو

احباب:۔ خوب!

آغا صاحب:۔

تمہاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے
نہ چوٹی ہو، نہ کنگھی ہو، نہ مسی ہو، نہ کاجل ہو

امراؤ جان:۔ اوئی! تو کیا دن رات سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھا رہے؟

آغا صاحب:۔ سادگی کا یہی مزا ہے، اور دوسرے خرچ کی بھی کفایت ہے۔ (اس مذاق میں لطف یہ ہے کہ امراؤ جان کسی قدر خسیس مشہور تھیں)۔

لگا ہم سے وہ جب مانگیں انہیں چپکے سے ہم دے دیں

نہ بک بک ہو، نہ جھک جھک ہو، نہ کچ کچ ہو، نہ کل کل ہو

احباب:۔ کیا مصرع کہا ہے!

خان صاحب:۔ اوپر کا مصرع بھی خوب لگایا۔ وہی ارذل کی رعایت چلی جاتی ہے۔

(امراؤ جان ہنستے ہنستے لوٹی جاتی تھیں)۔

آغا صاحب:۔ اچھا تو اب ایسے شعر نہ پڑھیں گے۔ ہمارا معشوق ذلیل ہوا جاتا ہے۔ نازک خیالی سنیے۔

تری نازک کمر کے باب میں چھلک بنا دیں گے
وہ کیا سمجھے یہ باریکی طبیعت جس کی گٹھل ہو

خان صاحب:۔ میں تسلیم کیے لیتا ہوں، میری طبیعت ایسی ہی ہے جیسا آپ ارشاد فرماتے ہیں، مگر برائے خدا اس چھلک کے معنی سمجھا دیجیے۔

آغا صاحب:۔ خیر خاطر ہے، سن لیجیے۔ محاسب لوگ خانہ پری کے لیے بجائے ندارد کے (X) نشان بنا دیا کرتے ہیں، اس لیے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم ہے۔ دوسرے ایک خط نے بیچوں بیچ سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی اور پھر جڑی ہوئی بھی ہے۔

خان صاحب:۔ یہ کیوں کر؟

آغا صاحب:۔ اب اس باریکی کو نہ پوچھیے۔ خیر حضرات واضح ہو کہ چھلک علم ریاضی میں علامت جمع کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی۔

مطلب یہ نکلا کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔

احباب:۔ حضرت! بس نازک خیالی کی حد ہو گئی! جو کوئی اتنا علم جانتا ہو وہ آپ کے شعر سمجھے۔

آغا صاحب:۔ اسی سے تو میں ایسے ویسوں کے سامنے پڑھتا نہیں۔ افسوس! استاد مرحوم زندہ نہ ہوئے، نہیں تو ان شعروں کی کچھ داد ملتی۔ اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے۔ خیر آپ یہ مقطع سن لیجیے۔ طبیعت کو کافت ہو گئی، کوئی قدر دان نہیں ہے۔

بس اے قزاق بس! طبع قیامت خیز کو روکو
غضب ہو جائے گا فوج مضامیں میں جو ہلچل ہو

احباب:۔ مقطع پھر عنایت ہو۔ (آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا)۔

نواب صاحب:۔ کیا زبردست تخلص رکھا ہے، قزاق!

آغا صاحب:۔ معاف فرمایئے گا ہے تو کچھ ایسا ہی، مگر کچھ ایسا نازیبا نہیں ہے۔ ایک تو خاندانی اعتبار سے، اس لیے کہ فدوی کے آباؤ اجداد دشت قبچاق میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ دوسرے اس سبب سے کہ استاد مرحوم سارق تخلص فرماتے تھے، اور یہ کچھ ایسا نامناسب بھی نہ تھا، اس لیے کہ (ان کی روح نہ شرمندہ ہو) عمر بھر اگلے شاعروں کے مضمون چرا چرا کے شعر موزوں فرمایا کیے۔ سارا دیوان ملاحظہ کر لیجیے، شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔ جب اشہب خامہ کی لگام میرے دست اقتدار میں آئی تو میں نے سرقے کو اپنی شان کے منافی سمجھ کے قزاق تخلص رکھ لیا۔ کچھ نہ سہی اس میں ایک طرح کا بانکپن تو ہے۔ بندے کا یہ دستور رہا ہے اور رہے گا کہ شعرائے ماضی و حال و استقبال کے مضامین زبردستی چھین کر اپنے قبضہ، تصرف میں کر لوں گا۔

نواب صاحب:۔ بہت مبارک!

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد فالسے کی برف جمائی گئی، اس کی دو دو قلفیاں احباب نے نوش کیں۔ سب اپنے اپنے مکان تشریف لے گئے۔ اس کے بعد دستر خوان بچھا۔ منشی صاحب نے اور میں نے اور امراؤ جان نے کھانا کھایا۔

منشی صاحب:۔ (امراؤ جان سے) ذرا اپنا وہ مقطع پڑھیے جو آپ نے پہلے پڑھا تھا۔

امراؤ جان:۔ کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

منشی صاحب:۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی دل چسپ ہوں گے۔ جب سے آپ نے یہ مقطع پڑھا ہے مجھے یہی خیال ہے۔ اگر آپ اپنی سرگزشت بیان کریں تو لطف سے خالی نہ ہو گا۔

میں نے بھی منشی صاحب کے کلام کی تائید کی، مگر امراؤ جان پہلو بچاتی تھیں۔ ہمارے منشی صاحب مہربان کو ابتدائے سن سے قصے کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ "الف لیلہ"، امیر حمزہ کی داستان کے علاوہ "بوستان خیال" کی کل جلدیں نظر سے گزری ہوئی تھیں۔ کوئی ناول ایسا نہ تھا جو آپ نے نہ دیکھا ہو، مگر لکھنؤ میں چند روز رہنے کے بعد جب اہل زبان کی اصلی بول چال کی خوبی کھلی، اکثر ناول نویسوں کے بے تکے قصے، مصنوعی زبان اور تعصب آمیز بیہودہ جوش دلانے والی تقریریں آپ کے دل سے اتر گئی تھیں۔ لکھنؤ کے بامذاق لوگوں کی گفتگو بہت ہی پسند آئی تھی۔ امراؤ جان کے اس مقطع

نے آپ کے دل میں وہ خیال پیدا کیا جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ القصہ منشی صاحب کے شوق اور میری اشتعالک نے امراؤ جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگزشت کہنے پر راضی ہو گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ امراؤ جان کی تقریر بہت شستہ تھی۔ اور کیوں نہ ہو، اول تو خواندہ دوسرے اعلیٰ درجے کی رنڈیوں میں پرورش پائی، شہزادوں اور نواب زادوں کی صحبت اٹھائی، محلات شاہی تک اس کی رسائی ہوئی۔ جو کچھ انہوں نے آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہو گا۔

اپنی سرگزشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں، میں ان سے چھپا کے لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ اس پر امراؤ جان بہت ہی بگڑیں مگر اب کیا ہوتا۔ آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔ خود پڑھا اور جابجا جو کچھ رہ گیا تھا اسے درست کر دیا۔

میں امراؤ جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان کی نواب۔۔۔ صاحب سے ملاقات تھی۔ انہی دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی۔ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان ہوا مجھے اس کے حرف بہ حرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، مگر یہ میری ذاتی رائے ہے، ناظرین کو اختیار ہے، جو چاہیں قیاس کر لیں۔

مرزا رسوا

لکھنؤ مارچ 1899ء

حصہ اول

(1)

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سنیے مرزا رسوا صاحب! آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزا ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد، نامراد، آوارہ وطن، خانماں برباد، ننگ خاندان، عار دو جہان کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔

اچھا سنیے اور اچھی طرح سنیے:

باپ دادا کا نام لے کر اپنی سرخ روئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ کچھ بہشتی، نائی، دھوبی، کہار۔ میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلے میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خان تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کاہے میں اسم تھے کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے، اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی، بھائی ابا ابا کر کے دوڑا، دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، بھیا کو گود میں اٹھا لیا، پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کتارے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں اور تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کتارا چھینے لیے جاتا ہے، میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے شروع ہو گئے "ابا اللہ! گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو! میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے، تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کر نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے، بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔" جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی۔ میں گئی، روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دستر خوان بچھا اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کے کھانا کھایا، خدا کا شکر ادا کیا۔ ابا نے عشا کی نماز پڑھی، سو رہے۔ صبح کو تڑکے ابا اٹھے، نماز پڑھی، اسی وقت میں کھٹک سے اٹھ بیٹھی، پھر فرمائشیں شروع ہوئیں:

"میرے ابا! آج نہ بھولنا، گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا! شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا۔"

ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے، کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے، ایک دو ہوائیں اڑاتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں، کیوں کہ ابا پہر دن چڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینے پرونے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلے میں نکل گئی، یا دروازے پر املی کا درخت تھا وہاں چلی گئی۔ ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے، بھیا کو بٹھا دیا، خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ ہائے کیا دن تھے! کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی۔ کیوں کہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی، وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا۔ اور سب ایک کٹھریا یا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی دو کھڑکیاں تھیں۔ دالان کے سامنے باورچی خانہ تھا دوسری طرف کوٹھے کا زینہ، کوٹھے پر ایک کھپریل، دو کوٹھریاں۔ کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں، چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے

گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا، محلے کی عورتیں خود ہی کنوئیں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے، تو لوگ انہیں جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں، ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ در حقیقت خوب صورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا، مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی، ناک نقشہ بھی خیر سے کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ ستواں نہ تھی، مگر چپٹی اور بہیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا، اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گل بدن کا پائے جامہ چھوٹے چھوٹے پائنچوں کا، ٹول کا نیفہ، نینو کی کرتی، تن زیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی۔ اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھی۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پڑا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا، مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے ہوئے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی، اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں نوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے، کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری تھی) کو بھی دیکھا تھا، بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے، کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں تو میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی، اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ! میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہم سن تھی) کے دولہا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے، میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منہ پر

کیہ بڑی سی داڑھی ہے، میرے دولہا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولہا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے، ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنتا ہے۔ میرا دولہا عید کے دن کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلا، گلبدن کا پائجامہ، مصالے کی ٹوپی، مخملی جوتا۔ کریمن کا دولہا سر میں ایک پھیتا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی، کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی، مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو، مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چندا ڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا تھا۔ موا چاندی کا تار تھا، شاید ایک آنے سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ یہ اب کہتی ہوں، اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی، قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے لیے میں اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی، مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کر رونے لگی، ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے۔ انہوں نے مجھے چمکارا، اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت میرے دل کو کسی قدر تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی، اماں ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی۔ مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہائی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے اسے گود میں نہیں لیا، مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا، گود میں اٹھا لیا، پیار کر لیا۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں، جلدی سے اتار دیا۔ اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں یہ سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا، لگیں گھرکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا، مگر جیاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہو گئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کی نیند حرام۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں، کسی سے تعویذ منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لیے اپنے گلے کا سب گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا کہ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو۔ دو ایک عدد جو نئے بنے ہوئے ہیں ان کو اجلوا دو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے، باقی نکال کے علیحدہ کر دیے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا "اوہ جی ہو گا تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہے، وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے

لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں، سسرال کا نام برا ہوتا ہے، میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔"

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدا آوارگی کی جوشِ وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا، جو کچھ نہ کریں کم ہے، کیوں کہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں، بہن جس کو دیکھتی ہیں، اسی حالت میں ہے، مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں، اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی، اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کم بخت، ادماتی تھی، شادی ہونے میں دیر ہوئی، کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی۔ اس نے چھوڑ دیا، کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی، آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں، ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں چاہا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا، نہ صورت شکل دیکھی، نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی، نکل کھڑی ہوئیں۔ یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا، رانڈ ہو گئیں۔ مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

دلاور خاں، جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا، مواڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد میں یہ گرفتار ہوا تو محلے سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لیے لوگ طلب ہوئے۔ ان میں ابا بھی تھے۔ ابا بے چارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ گرائی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا "ول جمعدار! تم

سچ سچ کہو یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا ایک کبوتر اڑا لیا۔ لینے گئے، نہ دیا۔ چار آنے دیتے تھے، وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے، جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں گھر سے کیوں نکلی تھی، دیکھتی کیا ہوں املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے۔ کہنے لگا "چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دیتے گئے تھے، کبوتر لے لو۔" میں اس کے دام میں آ گئی، ساتھ چلی گئی۔ جا کے دیکھتی ہوں، گھر میں کالی چڑیا نہیں۔ اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں مکان میں داخل ہوئی ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں، اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دی۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا۔ مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا، وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا۔ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا، کوئی بس نہیں۔ موذی کے جنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بہلی کے اندر مجھے گھٹنوں میں دبائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ موئے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اڑے چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی، چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے، سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی، دم نکلا جاتا تھا۔

آنکھوں سے باراں جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا تھا ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے۔ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہو گا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں باپ، مکان کا دالان، انگنائی، باورچی خانہ، سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہو گی۔ گودڑ اب میرے منہ میں نہ تھا، مگر مارے ڈر کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات پر گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں۔ دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا۔۔۔ تلملاتا پھرتا ہو گا۔

پیر بخش۔ بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوئے ہوں گے تمہیں

قید ہونے؟

دلاور خاں:۔ پورے بارہ برس ہوئے بھائی! لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں، خیر۔۔۔ وہ اس۔۔۔ کو تو کوئی دن کو یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا، میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش:۔ کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلاور خاں:۔ تم سمجھتے کیا ہو، جان سے نہ مارا ہو تو پٹھان کا تخم نہیں۔

پیر بخش:۔ بھئی تم قول کے سچے ہو، جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔

دلاور خاں:۔ دیکھنا!

پیر بخش:۔ اور اسے کیا کرو گے؟

دلاور خاں:۔ کریں گے کیا۔ یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔ راتوں رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے، دل میں ایک دھچکا سا پہنچا، منکا ڈھل گیا، ہاتھ پاؤں ڈال دیے۔ یہ حال دیکھ کر بھی موئے کٹر کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش:۔ اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ؟

دلاور خاں:۔ گلے گلے پانی۔

پیر بخش:۔ کہاں سے دو گے؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔

دلاور خاں:۔ گھر تو چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بیچ کر دے دوں گا۔

پیر بخش:۔ تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو، ہم نہ ایک بات بتائیں؟

دلاور خاں:۔ کہو۔

پیر بخش:۔ اماں لکھنؤ میں چل کے اسی چھوکری کے کوڑے کرو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا، مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔ پیر بخش کی یہ بات سن کے میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں:۔ اچھا دیکھا جائے گا، ابھی تو چلے چلو۔

پیر بخش:۔ یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں؟ وہ درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے، تھوڑی آگ لے آئیں

تو حقہ بھر لیں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا۔ پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف برا ہوتا ہے۔ اک بارگی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے۔ "حرام زادی! چپ نہیں رہتی۔ ابھی چھری بھونک دوں گا۔ نیل کرتی ہے۔۔۔۔"

پیر بخش:۔ (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہو گا) نہیں بھئی نہیں۔ ایسا کام نہ کرنا، تمہیں ہمارے سر کی قسم! اماں ہمیں تو آ لینے دو۔

دلاور خاں:۔ اچھا جاؤ آگ لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا، دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں:۔ (ایک کش حقے کا پی کر) تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش:۔ اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں! پکڑے گا کون؟ لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو؟

دلاور خاں:۔ کریم؟

پیر بخش:۔ ہاں! اس کی روٹی اسی پر ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا، لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لیے۔

دلاور خاں:۔ آج کل کہاں ہے؟

پیر بخش:۔ کہاں ہے؟ لکھنؤ میں ہو گا۔ گومتی اس پار اس کی سسرال ہے، وہیں ہو گا۔

دلاور خاں:۔ بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟

پیر بخش:۔ جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خاں:۔ بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟

پیر بخش:۔ سو ڈیڑھ سو، جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خاں:۔ بھائی کی باتیں! سو ڈیڑھ سو! اس کی صورت ہی کیا ہے؟ سو بھی ملیں تو بہت ہے۔

پیر بخش:۔ اچھا اس سے کیا ہے، لے تو چلو، مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر

بخش نے جواب دیا: "وہ تو ہم سمجھے ہی تھے، تم کیا ایسے بے وقوف ہو۔"

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ رگت سلب ہو گئی تھی، بدن سن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے، تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کمبل اوڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منہ پر سے کمبل سرکا کے جو دیکھا، معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کر دیکھا، سامنے کچھ کچے مکان ہیں، ایک بنیے کی دکان ہے۔ دلاور خاں اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں۔ بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسا کھا رہے ہیں۔ دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے تاپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آ کے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے مجھ کو دیے۔ رات بھر کی بھوکی تھی، کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا۔ میں نے تھوڑا سا پیا، پھر چپکی ہو کے پڑی رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں ٹھہری رہی۔ پھر پیر بخش نے بیل جوتے، دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا، گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی۔ نہ دلاور خاں کی چھری نکلی، نہ مجھ پر گھونسے پڑے، نہ گھرکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے، باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے، کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے، دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے، سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوچ ہونے لگی، آستینیں چڑھ گئیں، کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک گاڑی سے کود پڑتا ہے، دوسرا وہیں گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے، بات رفت گزشت ہوئی، ملاپ ہوا، دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک:- ہمارے تمہارے لڑائی ہی کیا! بات کی بات تھی۔

دوسرا:- بات ہی کیا تھی؟

پہلا:- اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔

دوسرا:- جانے دو۔

(2)

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد
شب اول ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شب اول کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی مرتے دم تک نہ بھولوں گی! مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیوں کر زندہ بچی۔ ہے ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندے ! دنیا میں تو خیر تو اپنی سزا کو پہنچا، مگر کیا اس سے میرے دل کو تسکین ہوئی؟ موئے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کے چیل کووں کو کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے، اور قیامت کے دن چاہے گا تو اس سے بدتر درجہ ہو گا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہو گا! کیسے تیری جان کو کلپتے ہوں گے۔ بس مرزا صاحب! اتنی آج کی باقی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امنڈا چلا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب چیخیں مار مار کے روؤں۔۔۔۔۔

آپ میری آوارگی کی سرگزشت سن کے کیا کیجیے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجیے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹھی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھبا نہ لگتا۔ یہ دین و دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔

ہاں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ اس کو بھی ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مر گئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے، ماشاء اللہ چودہ پندرہ برس کا، دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔ موئے ایک روپے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے، مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی، فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا رستہ تھا مگر دلاور خاں اس خوف سے کہ کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے، نہ معلوم کن چھپے راستوں سے لایا کہ کوئی آٹھ دن میں لکھنؤ پہنچی۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے، مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے وہیں لیے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا نام گھر میں سنا کرتی تھی، کیوں کہ میرے نانا یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لیے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

لکھنؤ میں گومتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لا کر اتارا۔ چھوٹا سا کچا مکان اور کریم کی ساس موئی مردے شوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی۔ ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے

لکھنؤ پہنچی تھی، دو پہر تک بند رہی۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپاتیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں چچہ بھر ماش کی دال اور پانی کی ایک بدھنی میرے آگے رکھ کر چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہو گئی۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چبینے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدھی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کے سو رہی۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی کیوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں دن رات کی تمیز تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا، کوئی آس نہ پاس۔ پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کے پڑ رہی۔ پھر نیند آ گئی۔ تیسری چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی، پڑی جاگتی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس، ڈائن کی شکل بکتی بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ گئی۔

"لونڈیا کتنا سوتی ہے۔ رات کو چیختے چیختے گلا پڑ گیا۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے اٹھایا، سانس ہی نہ لی۔ میں تو سمجھی تھی سانپ سونگھ گیا۔ اے لو وہ پھر اٹھ بیٹھی۔"

میں چپکے سنا کی۔ جب خوب بک جھک چکی تو پوچھنے لگی "پیالہ کہاں ہے؟" میں نے اٹھا دیا۔ وہ باہر لے کر نکلی۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ اسی کوٹھری میں ایک کھڑکی لگی تھی، اسے کھول دیا۔ مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا۔ یہاں آ کے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔ آج ارہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گزرے، تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی، اسی کوٹھری میں لا کے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا۔ بے چاری کیسی پھکو پھکو روتی رہتی۔ مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہو گیا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے چپکے باتیں ہوا کیں۔ کسی بنیے کی لڑکی تھی، رام دئی نام تھا۔ سیتا پور کے پاس کوئی گاؤں تھا، وہاں کی رہنے والی تھی۔ اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ جب حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا، میں نے اسے دیکھا۔ گوری گوری، بہت خوب صورت ناک نقشہ، ڈیل ذرا چھریرا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھری سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی۔ پھر تنہائی نصیب ہوئی۔ دو دن اکیلی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خان اور پیر بخش نے آ کے مجھے نکالا، اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی۔ پہلے ایک میدان سا ملا، پھر ایک بازار میں سے ہو کے گزرے۔ پھر ایک پل پر آئے۔ دریا لہریں مار رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپتی جاتی تھی۔ تھوڑی دور کے بعد

ایک بازار پھر ملا، اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں بہت دور تک چلنا پڑا، پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے۔ یہاں بڑی بھیڑیں تھیں۔ راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ اب ایک مکان کے دروازے پر پہنچے۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی، یعنی چوک۔ اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ذلت، عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی، جو کچھ دنیا میں ملنا تھا ملا، یعنی خانم جان کا مکان۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینے پر سے چڑھ کر اوپر گئی۔ مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دالان کے دہنی طرف ایک وسیع کمرے میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شان دار بڑھیا تھی! رنگ تو سانولا تھا، مگر ایسی بھاری بھر کم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں، مگر ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا سفید دوپٹا کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید۔ اودے مشروع کا پائے جامہ، بڑے بڑے پائنچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے، کانوں میں سادی دو دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ بسم اللہ کی رنگت، ناک نقشہ ہو بہو انہی کا سا تھا، مگر وہ نمک کہاں۔ اس دن کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں، کنول روشن ہے۔ بڑا سا نقشی پان دان آگے کھلا ہوا رکھا ہے۔ پیچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی بسم اللہ جان ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا۔ سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

"خانم جان:۔ یہی چھوکری ہے؟

دلاور خان:۔ جی ہاں!

مجھے پاس بلایا، پچکار کے بٹھایا، ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی۔

خانم:۔ اچھا! پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے، اور دوسری چھوکری کیا ہوئی؟

پیر بخش:۔ اس کا تو معاملہ ہو گیا۔

خانم:۔ کتنے پر؟

پیر بخش:۔ دو سو پر۔

خانم:۔ اچھا خیر، کہاں ہوا؟

پیر بخش:۔ ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحب زادے کے واسطے مول لیا ہے۔

خانم:۔ صورت شکل کی اچھی ہے، اس قدر ہم بھی دے نکلتے، مگر تم نے جلدی کی۔

پیر بخش:۔ میں کیا کروں، میں نے بہت سمجھایا، میرے سالے نے نہ مانا۔

دلاور خان:۔ صورت تو اس کی بھی اچھی ہے، آگے آپ کی پسند۔

خانم:۔ خیر آدمی کا بچہ ہے۔

دلاور خان:۔ اچھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے۔

خانم:۔ اچھا، تمہاری ہی ضد سہی۔

یہ کہہ کر حسینی کو آواز دی۔ حسینی گدبدی سی سانولی ادھیڑ عورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

خانم:۔ حسینی!

حسینی:۔ خانم صاحب!

خانم:۔ صندوقچہ لاؤ۔

حسینی گئی، صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپے دلاور خان کے سامنے رکھ دیے (بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپے تھے)۔ ان میں سے کچھ روپے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے۔ (سنا ہے کہ پچاس روپے) باقی دلاور خاں مردوے نے اپنے ڈب میں رکھے۔ دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے۔ اب کمرے میں خانم صاحب ہیں، بوا حسینی ہیں اور میں ہوں۔

خانم:۔ (حسینی سے) حسینی! یہ چھوکری اتنے داموں کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی؟

حسینی:۔ مہنگی! میں کہتی ہوں سستی۔

خانم:۔ سستی بھی نہیں ہے، خیر ہوگا۔ صورت تو بھولی بھالی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوف خدا نہیں۔ بوا حسینی! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا! آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔

حسینی:۔ خانم صاحب! یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں! بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں؟

خانم:۔ سنا کیوں نہیں۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے، سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا، سیخچوں سے داغ داغ کے مار ڈالا۔

حسینی:۔ دنیا میں جو چاہیں کر لیں، قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا۔

خانم جان:۔ منہ کالا ہوگا! جہنم کے کندے پڑیں گے۔

حسینی:۔ خوب ہوگا، موئیوں کی یہی سزا ہے۔

اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا۔

"بیوی یہ چھوکری تو مجھے دے دیجیے۔ میں پالوں گی۔ مال آپ کا ہے، خدمت میں کروں گی۔"

خانم:۔ تمہی پالو۔

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں، اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں، مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

حسینی:۔ بچی! تو کہاں سے آئی ہے؟

میں:۔ (رو کے) بنگلے سے۔

حسینی:۔ (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے؟

خانم:۔ اے ہے کیا ننھی ہو؟ فیض آباد کو بنگلہ بھی کہتے ہیں۔

حسینی:۔ (مجھ سے) تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟

میں:۔ جمعدار۔

خانم:۔ تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا وہ نام کیا جانے، ابھی بچہ ہے۔

حسینی:۔ اچھا تمہارا نام کیا ہے؟

میں:۔ امیرن۔

خانم:۔ بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں، ہم تو امراؤ کہہ کر پکاریں گے۔

حسینی:۔ سنا بچی! امراؤ کے نام پر تم بولنا۔ جب بیوی کہیں گی "امراؤ" تم کہنا "جی"۔

اس دن سے امراؤ میرا نام ہو گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی، لوگ امراؤ جان کہنے لگے۔ خانم صاحب مرتے دم تک "امراؤ" کہا کیں۔ بوا حسینی "امراؤ صاحب" کہتی تھیں۔ اس کے بعد بوا حسینی اپنی کوٹھری میں لے گئیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا، مٹھائیاں کھلائیں۔ منہ ہاتھ دھلایا، اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں، مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے، چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے، اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کر دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں،

جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں، اماں باورچی خانے میں ہیں اتنے میں جو ابا کو دیکھا دوڑ کے لپٹ گئی۔ رو رو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔ خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ بوا حسینی نے ہشیار کیا۔ آنکھ جو کھلی تو کیا دیکھتی ہوں، نہ وہ گھر ہے، نہ دالان، ابا ہیں، نہ اماں۔ بوا حسینی کی گود میں پڑی رو رہی ہوں۔ بوا حسینی آنسو پونچھ رہی ہیں۔ چراغ روشن تھا میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے بھی آنسو برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر وہ شفقت کی کہ چند ہی روز میں میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی۔ اور بھولتی نہ تو کرتی کیا! اول تو مجبوری، دوسرے نئے ڈھنگ، نئے رنگ۔ اچھا سے اچھا کھانے کو۔ کھانے وہ جن کے ذائقے سے بھی میں آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں بسم اللہ جان، خورشید جان، امیر جان ساتھ کھیلنے کو۔ دن رات ناچ گانا، جلسے، تماشے، میلے، باغوں کی سیر۔ وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔

مرزا صاحب! آپ کہیں گے کہ میں بڑے کٹر دل کی تھی کہ بہت ہی جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر بھر یہیں تیر کرنا ہے۔

جیسے نئی دلہن اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک دو دن کے لیے نہیں، بلکہ مرنے اور بھرنے کے لیے آئی ہوں، ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ راستے میں ان موئے ڈکیتوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اٹھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی، اور جو چیز ناممکن سمجھ لی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف 40 کوس ہے، مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق ہے۔

(3)

اک حال میں انساں کی بسر ہو نہیں سکتی
اب رنگ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہو گا کس قدر وسیع تھا کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی

ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا، ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوب صورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ، ہر وقت بنی ٹھنی، تولواں جوڑے پہنے۔ سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنے رہتے تھے، وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں نصیب نہیں ہوتے۔ خانم کا مکان کیا تھا، ایک پرستان تھا۔ جس کمرے میں جا نکلو، سوائے ہنسی مذاق، گانے بجانے کے کوئی اور چرچا نہ تھا۔ اگرچہ میں کم سن تھی، مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے، اپنے مطلب کی سب سمجھتی تھی۔

بسم اللہ اور خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کے میرے دل میں خود بہ خود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانے اور تھرکنے لگی۔ اسی عرصے میں میری تعلیم بھی شروع ہو گئی۔ میری طبیعت فن موسیقی کے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے استائی شروع کرا دی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سر بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سر کومل سے ات کومل، سدھ سے اسدھ یا تیور سے تیور تر ہو جائے۔ اور میری بھی تجنیں کرنے کی عادت تھی۔ پہلے تو استاد جی (خدا کرے ان کی روح شرمندہ نہ ہو) ٹال دیا کرتے تھے۔ ایک دن خانم صاحب کے سامنے میں رام کلی گا رہی تھی، دھیوت سدھ لگا گئی۔ استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسی کو کہوایا۔ میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی پھر باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔

خانم:- بھلا استاد جی، یہ کیا تھا؟ رام کلی میں او چار دھیوت سے ہے اور وہی سر ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں دھیوت کومل ہے یا سدھ؟

استاد:- کومل۔

خانم:- اور چھوکری نے کیا کہا تھا؟

استاد:- سدھ۔

خانم:- پھر آپ نے ٹوکا کیوں نہیں؟

استاد:- کچھ مجھے خیال نہ رہا۔

خانم:- واہ۔ خیال کیوں نہیں رہا۔ اسی لیے میں نے دوبارہ کہوایا۔ پھر بھی آپ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہے۔ آپ اسی طرح چھوکریوں کو تعلیم دیتے ہیں؟ ابھی کسی سمجھ دار کے

سامنے اس طرح گاتی تو کیا وہ میرے جنم میں تھوکتا۔

استاد جی اس وقت تو بہت ہی خفیف ہوئے، چپ ہو رہے، مگر دل میں بات لیے رہے۔ استاد جی اپنے کو نائک سمجھتے تھے اور تھے بھی ایسے ہی۔ اس دن خانم کا ٹوکنا ان کو بہت ناگوار ہوا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا گا رہی ہوں، خانم بھی موجود ہیں۔ میں نے استاد جی سے پوچھا "گندھار اس میں کومل ہے یا ات کومل؟"

استاد جی:۔ ات کومل۔

خانم:۔ خان صاحب! ماشاء اللہ! یہ میرے سامنے!

استاد جی:۔ کیوں؟

خانم:۔ اور پھر آپ مجھی سے پوچھتے ہیں "کیوں؟" سوہا میں گندھار ات کومل ہے؟ بھلا آپ تو کہیے۔

استاد جی:۔ گندھار کومل کو ات کومل لگا گئے۔

خانم:۔ بس آپ ہی قائل ہو جیے۔ خود آپ 'کومل' کہیں اور چھوکری کو 'ات کومل'۔ یا تو آپ چھوکری کو بہکاتے ہیں یا مجھے کستے ہیں۔ خان صاحب! میں کچھ عطائی نہیں۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں گلے سے چاہے نہ ادا ہو، مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا؟ میں بھی ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر بتانا ہو تو دل سے بتائیے، نہیں تو معاف کیجیے۔ میں کوئی اور بندوبست کروں گی۔ چھوکریوں کو غارت نہ کیجیے۔

استاد جی:۔ بہت خوب!

یہ کہہ کے اٹھ گئے۔ کئی دن نہیں آئے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند روز کے بعد خلیفہ جی بیچ میں پڑے، قسما قسمی ہو کے ملاپ ہو گیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک ٹھیک بتانے لگے۔ بتاتے نہ تو کرتے کیا۔ وہ خانم کو استانہ سمجھتے تھے۔ مجھے عمر بھر حیرت رہی کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد جی، کیوں کہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوئیں، استاد جی ان کو نہ بتا سکتے تھے یا جان بوجھ کے نہ بتاتے تھے۔ لاکھ قسما قسمی ہو چکی تھی، مگر پھر بھی یہ لوگ گر کی باتیں نہیں بتاتے۔ مجھے کچھ ایسا شوق ہو گیا تھا کہ جہاں کسی بات میں شک ہوا یا میں سمجھی کہ استاد جی ٹالتے ہیں، استاد جی کے جانے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت خوش ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کو لعنتیاں دیا کرتی

تھیں۔ بسم اللہ پر بہت محنت ہوئی، مگر ٹپہ ٹھمری کے سوا کچھ نہ آیا، اس پر بھی لے سے بائون رہیں۔ خورشید کی آواز اچھی نہ تھی۔ صورت پری کی، گلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ ان کا مجرا صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گانے کو ایک آدھ چیز سیدھی سادی گا بھی دیتی تھیں کہ گانے کا نام ہو جائے۔

خانم کی نوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرد تھیں، مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔ سیاہ جیسے الٹا توا، اس پر چیچک کے داغ، پاؤ بھر قیمہ بھر دو تو سما جائے۔ لال لال آنکھیں، بھدی ناک بیچ میں سے پچکی ہوئی۔ موٹے موٹے ہونٹ، بڑے بڑے دانت، فربہ انتہا سے زیادہ، اس پر ٹھنگنا قد۔ بونی ہتھنی کی لوگ پھبتی کستے تھے۔ مگر قیامت کا گلا تھا۔ معلومات بہت اچھی تھیں۔ مور چھنا ان ہی کے گلے سے نکلتے سنا۔ میں جب ان کے کمرے میں جا نکلتی، مارے فرمائشوں کے دق کر دیتی تھی۔

میں:۔ باجی! ہاں ذرا سرگم تو کہنا۔

بیگا:۔ سنو۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔

میں:۔ میں یہ نہیں مانتی، سرتیاں الگ الگ کر کے بتاؤ۔

بیگا:۔ لڑکی! تو بہت ستاتی ہے۔ اپنے استاد جی سے کیوں نہیں پوچھتی؟

میں:۔ اللہ! باجی تمھی بتا دو۔

بیگا:۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی دیکھ بائیس ہوئیں؟

میں:۔ (شرارت سے) اوئی، میں نے نہیں گنیں، پھر کہو۔

بیگا:۔ جا اب نہیں کہتی۔

میں:۔ واہ! میں تو کہوا کر چھوڑوں گی۔

بیگا:۔ پھر وہی! کہہ دیا، لے اب نہ ستا۔

میں:۔ ہاں اب کی گنیں، 'نی' میں دو ہیں نا؟

بیگا:۔ ہاں دو۔

میں:۔ تو ٹھیک بائیس ہوئیں۔ اب تینوں گرام کہہ دو۔

بیگا:۔ لے اب ٹہلیے، کل آئیے گا۔

میں:۔ اچھا تنبورہ اٹھا لاؤں، کچھ گاؤ۔

بیگا:۔ کیا گاؤں؟

میں۔ دھناسری۔

بیگا۔ کیا گاؤں؟ استائی، دھرپد، ترانہ؟

میں۔ اللہ! باجی دھرپد گاؤ۔

بیگا۔ لے سن۔

"تن کی تپ، تب ہی مٹے جب پیارے کو درشٹ بھر دیکھوں گی۔
جب درشن پاؤں گی ان کا تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی !۔
اشٹ جام دھیان موہے وا کو رہت ہے رے نا جانوں کب درشن تھییوں گی
جو کو ہو پربھو پیارے سے ملا دے وا کے پائن میں سیس ٹیکوں گی

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی، بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکر تھے۔ حسب دستور میں بھی مکتب میں بھیجی گئی۔ مولوی صاحب کا نورانی چہرہ، سفید کترواں داڑھی، صوفیانہ لباس، ہاتھ میں عمدہ عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں، خاک پاک کی تسبیح، اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی، ہروتی کی جریب، چاندی کی شام، بہت ہی نفیس ڈیڑھ خمہ حقہ، افیون کی ڈبیا، پیالی، غرضیکہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔ کیا ستھرا مذاق تھا! وضع دار بھی ایسے کہ کسی زمانے میں بوا حسینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا، آج تک اسے نباہے جاتے تھے۔ بوا حسینی بھی انہیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ بڑھیا بڈھے میں اس مزے کی باتیں ہوتی تھیں کہ جوانوں کو توصلہ ہوتا تھا۔ مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔ گھر پر خدا کے دیے گاؤں گراوں، مکان، بیوی، جوان لڑکے لڑکیاں، سب کچھ موجود تھا، مگر خود جب لکھنؤ میں تحصیل علم کے لیے تشریف لائے، یہیں کے ہو رہے۔ شاید دو چار مرتبہ گئے ہوں گے۔ اکثر عزیز ملنے کو یہیں چلے آتے تھے۔ گھر سے کبھی کبھی کچھ روپیہ بھی آیا کرتا تھا۔ دس روپے خانم صاحب دیتی تھیں۔ یہ سب بوا حسینی کو ملتا تھا۔ کھانے پینے، حقہ افیون کی تاک بوا حسینی لیتی تھیں۔ تحویل دار بھی بوا حسینی تھیں۔ کپڑا بوا حسینی بنوا دیتی تھیں۔ خانم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھیں، بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے بوا حسینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمے لی تھی، اس لیے مجھ پر مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی۔ یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے تھے، پاس ادب مانع ہے۔ اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔ مجھ ایسی کندہ ناتراش کو انہوں نے آدمی بنا دیا۔ یہ ان ہی کی

جوتیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیر رئیس کی محفل میں گئی، حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ ان ہی کی بدولت آپ ایسے لائق فائق صاحبوں کے جلسے میں منہ کھولنے کی جرأت ہوئی، شاہی درباروں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا، اعلیٰ درجے کی بیگمات کے محل میں گزر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔ الف بے ختم ہونے کے بعد کریما، مامقیما، محمود نامہ صرف رواں پڑھا کے آمد نامہ یاد کرا دیا۔ اس کے بعد گلستاں شروع کرا دی۔ دو سطریں پڑھاتے تھے۔ سبق حفظ کرایا جاتا تھا، خصوصاً اشعار۔ لفظ لفظ کے معنی، فقرے فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت کی۔ املا درست کرایا گیا، خط لکھوائے گئے۔ گلستان کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہو گئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھا جاتا ہے۔ عربی کی صرف نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں، اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

(4)

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں طوطے کی طرح
مکتب عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا گوہر مرزا۔ حد کا شریر اور بدذات۔ سب لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی کے چٹکی لے لی۔ اس کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی، اس کے کان دکھا دیے۔ دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی، کہیں کتاب پر دوات الٹ دی۔ غرض اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دھپیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے، مگر وہ اپنی آئی بائی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر میری گت بناتا تھا، کیوں کہ میں سب سے انیلی اور گیگلی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتی تھی۔ میں نے بھی مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے اکثر مار پٹوائی، مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں ہی چٹلیاں کھاتے کھاتے عاجز آ گئی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو اس بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آ جاتا تھا۔

گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی بوا حسینی تھیں۔ نواب سلطان علی خاں ایک بڑے عالی خاندان رئیس تھے۔ توپ دروازے میں رہتے تھے۔ ان سے اور بنو ڈومنی سے رسم تھا۔ انہی سے یہ

لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب ترک ملاقات ہوئے مدت گزر گئی تھی، مگر دس روپے ماہ بہ ماہ لڑکے کی پرورش کے لیے دیے جاتے تھے اور بیگم صاحبہ سے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بنو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں، وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ گوہر مرزا بچپن ہی سے ذات شریف تھے۔ تمام محلے کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینک دیا، کسی کی کنکیا چھین لی، کسی کی مرغی کی ٹانگیں توڑ دیں، کسی لڑکے سے چڑ کوؤں کا پنجرہ دیکھنے کو مانگا، اس نے دے دیا، آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی، سب چڑ کوے پھر سے اڑ گئے۔ غرض کہ طرح طرح کے آزار دیتے تھے۔ آخر ماں نے عاجز ہو کر محلے کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔ یہاں بھی آپ نے اپنے ہتھکنڈے نہ چھوڑے۔ تمام ہم مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالی، ایک لڑکے کی جوتی کنوئیں میں ڈال دی۔ ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے، حضرت نے ان کا نیا چڑھواں جوتا حوض میں تیرا دیا، خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے ہیں۔ استے میں کہیں سے مولوی صاحب سر پر پہنچ گئے۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب ہی مرمت ہوئی۔ مولوی صاحب نے مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیا، اور کان پکڑے ہوئے بنو کے گھر پر لے آئے۔ دروازے پر سے پکار کے کہا "لو صاحب اپنا لڑکا، ہم اسے نہ پڑھائیں گے۔" یہ کہہ کر مولوی صاحب تو ادھر گئے، گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے روتا ہوا گھر میں آیا۔ اس وقت اتفاق سے بوا حسینی بنو سے بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ حال دیکھا، آپ کو بہت ہی ترس آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ تھیں نہیں، مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگیں۔

بوا حسینی:۔ اے ہے مولوی کاہے کو، موا قصائی ہے۔ لڑکے کا منہ مارے طمانچوں کے سجا دیا۔ اے لو، کان بھی تو لہولہان کر دیئے۔ نابی بی، ایسے مولوی سے کوئی نوج پڑھوائے۔ آخر ہمارے مولوی صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چمکار کے دلار کے پڑھاتے ہیں۔

بنو نے چھوٹتے ہی کہا "پھر بوا حسینی، اس کو بلا سے اپنے مولوی صاحب ہی کے پاس لے جاؤ۔"

بوا حسینی:۔ لے تو جاؤں، مگر بہت دور ہے۔

بنو:۔ تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کروں گی، شام کو بلوا لیا کروں گی۔

بوا حسینی:۔ اچھا تو بھجوا دیا کرو۔

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا نہ تھا اس لیے کہ بوا حسینی کو اپنے حسن خدمت پر پورا بھروسا تھا۔ جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لیے مٹھائی کا خوان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔ بوا حسینی نے خوشی خوشی مٹھائی تقسیم کی، لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

----- ----- -----

گوہر مرزا سب سے زیادہ مجھی کو ستاتا تھا۔ دن رات داد بیداد کا غل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت بہت مارا، مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ آخر میری اس کی صلح ہو گئی، یا یوں کہیے کہ میں اس کے ستانے کی خوگر ہو گئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ ہی فرق ہو گا۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال بڑا ہو۔ جس زمانے کا حال لکھ رہی ہوں، میرا سن کوئی تیرہ برس ہو گا اور گوہر مرزا کو چودھواں پندرھواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مزا آنے لگا تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی (ڈومنی کا لڑکا تھا) قدرتی لے دار۔ بتانے میں مشاق، بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ ادھر میں لے سر سے آگاہ۔ جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے خوب جلسہ ہوتا تھا۔ میں گانے لگی وہ بتانے لگا۔ کبھی وہ گا رہا ہے، میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز پر اور رنڈیاں بھی فریفتہ تھیں۔ ہر ایک کمرے میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ایک ضروری بات تھی، کیونکہ بغیر میری اس کی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔

سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر غش تھیں۔

مرزا صاحب! آپ کو امیر جان یاد تو ہوں گی؟

رسوا:۔ یاد ہیں، کہے جاؤ۔

امیر جان کا وہ زمانہ جب وہ مفتخر الدولہ بہادر کی ملازم تھیں، اللہ رے جوبن کے ٹھاٹھ! وہ اٹھتی ہوئی جوانی!

کھلتی کھلتی وہ چمپئی رنگت
بھولی بھالی وہ موہنی صورت
بانکی بانکی ادائیں ہوش ربا
ترچھی ترچھی نگاہیں قہر خدا

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں!

رسوا:۔ اب تو میں نے جب ان کو دیکھا ہے، انگنی پر ڈالنے کے لائق تھیں۔ ایسی بری صورت

ہو گئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

امراؤ۔ کہاں دیکھا تھا ؟

رسوا۔ انھی کے گھر میں دیکھا تھا جن کے کمرے کے سامنے ایک شاہ صاحب گیروے کپڑے پہنے، ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے تھے۔ ادھر سے جو نکلتا اس کو سلام کر لیتے تھے، کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔

امراؤ۔ سمجھ گئی! وہ شاہ صاحب ان کے عاشقوں میں تھے۔

رسوا۔ جی ہاں، کیا میں نہیں جانتا!

امراؤ۔ اچھا تو اب وہیں رہتی ہیں؟

رسوا۔ ان کی مصاحبت میں ہیں۔

امراؤ۔ اور ان کا حال کیا ہے؟

رسوا۔ وہ ایک حکیم صاحب پر مرتی ہیں۔

امراؤ۔ کون حکیم صاحب؟

رسوا۔ آپ نہیں جانتیں۔ نام بھی بتا دوں گا تب بھی آپ نہیں سمجھیں گی، پھر کیا فائدہ؟

امراؤ۔ خیر کچھ بتا دیجیے، میں سمجھ جاؤں گی۔

رسوا۔ وہ نخاس۔۔۔۔۔

امراؤ۔ خوب جانتی ہوں۔ یہی امیر جان اس زمانے میں ایسی تھیں کہ لوگ ان کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو کرتے تھے۔ مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسے کا تو ذکر ہی کیا ہے، اچھے اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے۔ چار چار مہریاں ساتھ۔ ایک گڑ گڑی لیے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھیا ہے، ایک کے پاس خاصدان ہے۔ خدمت گار وردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔

امیر جان، گوہر مرزا کے گانے پر غش تھیں۔ خود گانا جانتی نہیں تھیں، مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔

گوہر مرزا بچپنے ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی۔ صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی۔ رنگ تو کسی قدر سانولا تھا مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا۔ اس پر نمک اور جامہ زیبی، شوخی، شرارت کوئی بات۔۔۔۔۔!

رسوا۔ کیوں نہ ہو، کس ماں کا بیٹا تھا!

امراؤ۔ اہا! تو کیا آپ نے بنو کو بھی دیکھا تھا؟

رسوا۔ (مسکراتے ہوئے) جی ہاں، آپ ہی قیاس کر لیجیے۔

امراؤ۔ مرزا صاحب! آپ کے مذاق بھی کیا در پردہ ہوتے ہیں!

رسوا۔ خیر آپ نے تو پردہ فاش کر دیا۔

امراؤ۔ تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق ہی رہے۔ میری سرگزشت کو آگ لگائیے۔

رسوا۔ مذاق کے لیے شب بھر باقی ہے، آپ اپنا قصہ کہیے۔

امراؤ۔ دیکھیے دوسری ہوئی۔ اچھا سنیے۔

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کس کی مجال تھی کہ دم بھر کے لیے کہیں کھسک جائے۔ اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے جاتے تھے۔ اس وقت ہم کو فرصت ملتی تھی۔ پھر ایک ایک کمرا ہے اور ہم ہیں۔ آج امیر جان کے پاس، کل جعفری کے کمرے میں، پرسوں بین کے ہاں۔ پھر جہاں جاؤ خاطر مدارات، میوہ مٹھائیاں، حقہ پان۔

رسوا۔ آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟

امراؤ۔ جی ہاں! گوہر مرزا کی دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوس ہوئی تھی، شوقیہ پیتی تھی، پھر تو نگوڑی لت ہو گئی۔

رسوا۔ گوہر مرزا صاحب تو چنڈو بھی پیتے تھے۔ عجب نہیں آپ نے اس میں بھی ان کی ہوس کی ہو؟

امراؤ۔ خدا نے اس سے تو آج تک بچایا، مگر ہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی۔ وہ بھی اب شروع کی ہے۔ کربلائے معلیٰ سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوئی، آئے دن زکام رہتا تھا۔ حکیم صاحب نے کہا افیون کھاؤ، کھانے لگی۔

رسوا۔ اور وہ چیز نزلے کو روکنے والی؟

امراؤ۔ اب اس کا ذکر نہ کیجیے۔

رسوا۔ کیا تائب ہو گئیں؟

امراؤ۔ مدت سے۔

رسوا۔ واقعی کیا بری چیز ہے، اپنا تو یہ حال ہے:

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

امراؤ:- ہائے کیا شعر کہا ہے! مرزا صاحب! قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں، پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار ہے۔

رسوا:- آپ بھی شغل کیجیے گا؟

امراؤ:- توبہ!

رسوا:- توبہ!

ابر بھی ہے، ہوائے سرد بھی ہے
پھر وہ، یادش بخیر، یاد آئی

امراؤ:- بس اب طبیعت کو روکیے، جمائیاں آنے لگیں، للہ اس ذکر کو جانے دیجیے۔

رسوا:- جانے دیجیے۔

امراؤ:- مذاق سے بھی معاف رکھیے:

اب نہ ہم منہ لگائیں گے اس کو
یاد آئی تو خیر یاد آئی!

رسوا:- واللہ امراؤ جان، کیا شعر ہے!

امراؤ:- تسلیم۔

دیکھ کے مشہد ادا ان کو
لالہ و گل کی سیر یاد آئی!

رسوا:- ماشاء اللہ! طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو، عالم شباب کے ذکر کی تاثیر ہے۔

امراؤ:- جی نہیں، شراب کے ذکر کی تاثیر ہے:

زاہدو! آج ہم کو پھر وہ شے
جس سے ہے تم کو بیر، یاد آئی

رسوا:- آہاہاہا! کیا قافیہ نکالا ہے، اور کہا بھی خوب ہے!

امراؤ:- کعبے سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ
پھر وہی راہ دیر یاد آئی

رسوا:- اے کیا کہنا! یہ "کعبے سے پھر کے" کیا خوب کہا ہے!

امراؤ:- مرزا صاحب! اسے مطلع نہ کر دیجیے:-

پھر کے کعبے سے سیر یاد آئی
پھر ہمیں راہ دیر یاد آئی

رسوا:- خاصہ۔

امراؤ:- روش وحشی و طیر یاد آئی
دشت وحشت کی سیر یاد آئی

رسوا:- یہ مطلع بھی برا نہیں ہے۔

امراؤ:- یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہم کو بنت العنب سے شکوہ ہے
کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی

رسوا:- میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجیے اور پھر اپنا قصہ دہرانا شروع کیجیے۔

ہوا بھی، ابر بھی، گلزار بھی، شراب بھی ہو!
یہ سب تو ہو، مگر اگلا سا وہ شباب بھی ہو

امراؤ:- واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل ہی مردہ کر دیا۔ خیر آمدم بر سر مطلب۔ اسی طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گزرے۔ اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گزرا جس کا بیان ضروری ہو۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بسم اللہ کی مسی بڑے دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دلارام کی بارہ دری اس جلسے کے لیے سجائی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں، ڈوم، ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب ہی تو تھے۔ دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویے دلی سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول کے حصے تقسیم کیے ہیں اس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ، خانم کی اکلوتی لڑکی تھی، جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ نواب چھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدۃ الخاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا۔ بہت ہی کم سن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کمپا مارا، بے چارہ پھنس ہی تو گیا۔ پچیس تیس

ہزار روپے نواب صاحب کے اس جلسے میں خرچ ہوئے۔ اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہوئیں۔ دم ہوش چاہتے تھے۔

مرزا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں، ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بے باک ہوتی ہیں، مگر اس بے باکی کا ایک زمانہ خاص ہوتا ہے۔ سن کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے۔ جوش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گزر جاتی ہیں، سن سے اتر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہیے تاکہ اعتدال قائم رہے۔ آخر رنڈیاں بھی عورت ذات ہیں، ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟

رسوا:- کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابل سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیے۔

امراؤ:- اوئی! تو کیا پڑھنے لکھنے سے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا ہے؟ یہ آپ نے خوب کہی!

رسوا:- اچھا اچھا تو آپ کہیے، فضول باتوں سے میرا وقت ضائع نہ کیجیے۔

امراؤ:- کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجیے گا۔

رسوا:- اور آپ کیا سمجھتی ہیں؟

امراؤ:- ہائے فضیحت! توبہ کیجیے، یہ مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کریں گے۔

رسوا:- خیر اگر میرے ساتھ آپ رسوا ہوں گی تو کوئی قباحت نہیں:

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ:- نوج آپ سے کوئی محبت کرے!

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو
بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر

رسوا:- کس کا شعر ہے؟

امراؤ:- یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہیں؟

رسوا:- ہاں سمجھا۔ تو یہ کہیے کہ آپ نے بھی یہ غزل سنی ہے۔

امراؤ:-

جاتے ہیں جان بچ کے بازار عشق میں
ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کیے بغیر

رسوا:- اور وہ شعر یاد ہے وہ تقاضا کیے بغیر؟

امراؤ:-

وعدہ ہو یا کہ قول، وہ ایسے ہیں نا دہند
ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کیے بغیر

رسوا:- اور کوئی شعر یاد ہے؟

امراؤ:- اور تو کوئی یاد نہیں آتا۔

رسوا:- یہ تو بہت بڑی غزل تھی، دیکھنا کہیں پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔

امراؤ:- ابھی سے نہ منگوالو؟

رسوا:- خود جا کے لکھ لاؤں تو ممکن ہے۔ وہ تو ہرگز نہ لکھیں گے۔

امراؤ:- یہ بھی کوئی بات ہے؟

رسوا:- جی ہاں، آپ کو نہیں معلوم۔ مسودے کے سوا غزل صاف کرنے تک کی قسم ہے۔

امراؤ:- اچھا ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں۔ ہاں ایک شعر اور یاد آیا:

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں
باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کیے بغیر

اور سنیے:-

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ
چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر

رسوا:- میری بھی غزل اسی طرح میں تھی، مگر خدا جانے کیا ہوئی، صرف مقطع یاد رہ گیا تھا۔

امراؤ:- مقطع پھر سنائیے، کیا خوب کہا ہے!

رسوا:-

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم

چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ:۔ واقعی خوب کہا ہے! مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف دیا۔

رسوا:۔ تخلص کا ذکر نہ کیجیے۔ ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اپنے اچھے خاصے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوئے جاتے ہیں۔ وہ تو کہیے میرا نام نہیں جانتے، نہیں تو کیا عجب ہے لوگ نام بھی بدل ڈالیں، مگر میں تو خوش ہوں، اس لیے کہ انگریزی رسم کے مطابق باپ بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں۔ جس قدر نسل ترقی کرے گی میرا نام روشن ہو گا۔

رسوا:۔ لے اب ٹالیے نا، جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ کہنا ہی پڑے گا۔

امراؤ:۔ کیا زبردستی ہے؟ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں۔

رسوا:۔ بیاہ براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی!

امراؤ:۔ آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں، ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں، وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات کی رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں مردوں میں۔ واقعی مرزا صاحب شہر ہو یا دیہات، یہ رسم تو کچھ اچھا نہیں ہے۔

رسوا:۔ آپ کے کہنے سے اچھا نہیں ہے۔ ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سنا ہے، اچھے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں بہنیں پنی جا رہی ہیں اور یہ خوش ہیں، باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا۔ اس کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کو جو بے ہودگیاں با عصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں اس کا ذکر بھی فحش سے خالی نہیں۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجیے، آپ بیتی کہیے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں، جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔

امراؤ:۔ آپ نہ مانیے گا، سنیے۔

جب سے بسم اللہ کی مسی ہوئی، خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہو گئیں۔ بے باکی کی سند حاصل ہو گئی، آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں ان کی

نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے جدا جدا سجا دیے گئے تھے۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے، فرش پر ستھری چاندنی کھنچی ہوئی، بڑے بڑے نقشی پاندان، مقابے، حسن دان، خاصدان، اگالدان اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر حلبی آئینے، عمدہ عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی، جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ، ادھر ادھر ہانڈیاں۔ سرشام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں۔ دو دو مہریاں، دو دو خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ خوب صورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندی کی گڑگڑی منہ سے لگی ہوئی ہے، سامنے پاندان کھلا ہوا ہے، ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں، چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پروا ہی نہیں کرتیں۔ جو ہے انھی کے حکم کا تابع ہے۔ حکومت بھی وہ کہ زمین آسمان ٹل جائے، مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا، بن مانگے لوگ کلیجہ نکال نکال کے دیے جاتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے، کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی نہیں قبول ہوتی، کوئی بات نظر میں نہیں سماتی۔ بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دے دے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں۔ غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے۔ ناز وہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے، مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے، مگر مرنے والے مرہی جاتے ہیں۔ ادھر اس کو رلا دیا ادھر اسے ہنسا دیا۔ کسی کے کلیجے میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلوؤں سے مسل ڈالا۔ بات بات میں روٹھی جاتی ہیں، لوگ منا رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے، کوئی منت کر رہا ہے۔ قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہیں ان کی طرف ہیں، یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا ادھر ہی سب دیکھنے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں۔ اور لطف یہ کہ دل میں کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی سچ ہے، یہ بھی سچ ہے، فقط بناوٹ۔ اگر وہ بے چارہ اس فریب میں آگیا، پھر کیا تھا، پہلے بظاہر خود مرنے لگیں:

آج کل ان کو بہت ہے مری خاطر منظور
یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے

مریں ان کے دشمن، آخر اسی کو مار ڈالا۔ اب جا کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔ اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ بیٹھی یاروں کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں۔

مرزا صاحب! ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بیان کر سکتے ہیں، مگر یہ کرشمے دیکھ دیکھ کے جو کچھ میرے دل پر گزرتی تھی، ان کو میں ہی خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے، اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں، اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں۔ نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں، نہ کسی پر جان دیں۔ مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا۔ بوا حسینی کی کوٹھری جو در و دیوار سے لے کر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی، اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ اس پر ہم اور بوا حسینی رات کو پڑ رہتے تھے۔ ایک طرف اس کوٹھری میں چولھا بنا ہوا تھا، اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوئے تھے۔ یہیں دو بد قلعی سی پتیلیاں، لگن، توا، رکابیاں، پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آٹے کی مٹکی رکھی رہتی تھی۔ اس کے اوپر دو تین دالیں، نمک، مصالحہ ہانڈیوں میں، اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں، سوختے، مصالحہ پیسنے کی سل، بٹا۔ خلاصہ یہ کہ تمام کرکری خانہ یہیں تھا۔ چولھے کے اوپر دیوار میں دو کیلیں لگی تھیں، کھانا پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت کی بتی پڑی ہے۔ موا اندھا اندھا جل رہا ہے۔ لاکھ اکساؤ، لو اونچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری کی آرائش میں دو چھینکے بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن، دال کی پتیلی، چپاتیاں، مولوی صاحب کے واسطے ڈھانک کے رکھ دی جاتی تھیں۔ پیاز والا چھینکا تو چولھے کے قریب تھا اور یہ دوسرا میرے سینے پر تھا، جس کے بوجھ سے کھانا گویا میرے سینے پر دھرا رہتا تھا۔ اگر پلنگ پر اچانک اٹھ کھڑی ہوئی تو سالن کی یہ پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔ صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں، اور شام سے نو بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور سارنگی کے گزوں کی مار۔ یہ ہمارا پیار اخلاص تھا۔ یہ سب کچھ تھا، مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی۔

اول اول تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھری سے ٹلیں ادھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا، اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی، بلکہ اوروں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی، اگرچہ در حقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا۔ تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی؟ اب بھی سینکڑوں سے اچھی ہو، اس وقت تو اور بھی جوبن ہوگا۔

امراؤ۔ تسلیم! خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجیے، بالکل بے محل اور بے موقع ہے، معاف

کیجیے گا۔ مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال تھا اور یہ خیال میری جان کے لیے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی، ہائے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔

رسوا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کی آپ کی طرف توجہ نہ ہو، نگاہیں ضرور پڑتی ہوں گی، مگر بات یہ تھی کہ آپ کی مسی نہیں ہوئی تھی۔ خانم سے لوگ ڈرتے تھے اس لیے آپ سے کوئی نہ بولتا ہوگا۔

امراؤ۔ شاید یہی ہو، مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی۔ میری تو وہ مثل تھی "بی دولتی اپنے تیسے میں آپ کھولتی" اپنی ہمجولیوں کو دیکھ دیکھ کے پھکی جاتی تھی، کھانا پینا حرام تھا، راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

اسی زمانے میں پھر کنگھی چوٹی کا شوق ہوا۔ کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا اس لیے کہ کوئی چوٹی گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھبن صاحب اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے، میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا؟ وہی بوا حسینی، وہ بھی جب انھیں فرصت ہوئی، نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں، سر جھاڑ منہ پہاڑ پھر رہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا۔ اور سب رنڈیاں دن میں تین جوڑے بدلتی تھیں، یہاں وہی آٹھویں دن۔ پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کارچوبی جوڑے پہنتی تھیں، یہاں وہی گلبدن کا پاجامہ، ململ کا دوپٹا، بڑی بڑائی ہوئی لچکے کی تیلی دے دی گئی۔

اس پر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں۔ کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی، کبھی امیر جان کے پاس، مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانے سے اٹھا دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی مزیداریوں کا خیال تھا، مجھے کون بیٹھنے دیتا!

اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کسی قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھینگا دکھا دیا، کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی کے چٹکی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاوٹ کرتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ میرے بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتی تھی، وہ مجھے چھیڑتا تھا۔ میں اسی کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا کہیں دو

نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں، مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلوا سوہن کی ٹکیہ لیتا آیا، مجھ کو کھلا دی۔ ایک دن نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا، وہ بھی مجھے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپے میں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے، مگر اس ایک روپے کے پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس سے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے، مگر روپیہ کبھی نہ ملا تھا، وہ روپیہ بہت دنوں تک میں نے جگو رکھا، اس لیے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی اور اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے ملا، تو کیا بتاؤں گی؟ راز داری کی سمجھ مجھے بھی آ گئی تھی، اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز کو پہنچے نہیں آتی۔ بے شک میں سن تمیز کو پہنچ چکی تھی۔

(5)

ایک شاطر چور دل میرا چرا کر لے گیا
پاسباں کم بخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار اوپر دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چراغ گل ہو گیا۔ اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں۔ کہیں سے گانے کی آواز آ رہی ہے، کہیں قہقہے اڑ رہے ہیں، ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گزر رہی ہے، دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے، مارے ڈر کے دولائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے، کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں میری آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں معلوم ہوا جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ میری گھگھی بندھ گئی۔ منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ آخر بے ہوش ہو گئی...... صبح کو چور کی ڈھونڈیا ہوئی۔ وہ کہاں ملتا ہے! خانم منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں، بوا حسینی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے تھک گئے، مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔

رسوا:۔ یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہو تو کیوں بتاؤں۔

امراؤ:۔ خیر اب حاشیے نہ چڑھائیے، سنتے جائیے۔

خانم کی اس دن کی مایوسی اور بوا حسینی کا اداس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی

ہے۔

رسوا:۔ کیوں نہ ہنسی آئے، ان کی تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا مذاق ہو گیا۔

امراؤ:۔ امیدیں خاک میں مل گئیں؟ خانم کو آپ نہیں جانتے، ایک ہی لکھا بیسوا تھیں۔ اس معاملے کو اس طرح دبا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور التیام کی وہ تدبیریں کیں کہ شاید و باید۔

اب کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک ہدہد پھنس ہی گیا۔ ان دنوں ملک آئین سے ایک صدر الصدور کے صاحب زادے طالب علمی کے لیے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ گھر سے خوش، والد مرحوم ان کے رشوت نذرانے کے روپے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف بے جا کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آ کر اچھے رہے، پھر جو لکھنؤ کی ہوا لگی، علم تماش بینی میں طاق اور فن بے غیرتی میں مشاق ہو گئے۔ اسم شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے، لکھنؤ کے کسی استاد نے مرشد بنا دیا۔ اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہم راہ آئے تھے وہ سب رکھن میاں کہتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے ان کو راجا کا لقب دیا، مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی اور آپ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرے تھے، اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر سے آئے تھے تو خاصی داڑھی منہ پر تھی، لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی پہلے کترواں ہوئی، پھر خشخاشی اور تھوڑے دنوں کے بعد بالکل صفایا ہو گیا۔

داڑھی منڈانے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بدنما نکل آیا، مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ سیاہ رنگ، چیچک کے داغ، بھدی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، گال پچکے ہوئے، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، ٹھنگنا سا قد، غرض یہ کہ بہ ہمہ صفت موصوف تھے، مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے تھے۔ پہروں آئینہ سامنے رہتا تھا۔ مونچھیں اس قدر مروڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دم ہو گئیں۔ بال بڑھائے گئے، گھونگھر بنایا گیا، نکے دار ٹوپی سر پر رکھی گئی، اونچی چولی کا انگرکھا ڈانٹا گیا، بڑے پانچوں کا پاجامہ پہنا گیا۔ یہ سب ٹھاٹھ رنڈیوں کی دربار داری کے لیے کیا گیا تھا۔

اول تو خود ہی طبیعت بہت رسا تھی، دوسرے لائق احباب کی وساطت سے چند ہی روز کے بعد اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہو گئی۔ رسائی کیسی، بے تکلفی بڑھ گئی۔ چھمن جان سے مادر پدر ہوتا ہے، بگن نیپیں لگاتی ہیں، حسنا نے جوتا کھینچ مارا، آپ ہیں کہ ٹھی ٹھی ہنس رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا، مگر نائکاؤں کا بڑا ادب کرتے تھے۔ جس رنڈی سے ایک شب کے لیے بھی واسطہ ہو گیا، اس کی نائکہ کو مجمع عام میں اماں جان کہنا اور جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی

تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرف ہو چکے ہیں۔

سرِ شام سے دو تین گھڑی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے۔ ان کی ہر ایک نوچی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھمریاں خود تصنیف فرماتے، خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے، خود ہی بھاؤ بتاتے جاتے تھے۔ ادر تو جو کچھ تھا منہ سے طبلہ خوب بجاتے تھے۔ یاروں نے خوب ہی بنا لیا تھا۔ آپ کے اشعار پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو فخر آتش و ناسخ بنا دیا۔ مشاعروں میں ڈریا لے گئے۔ آپ سے غزل پڑھوائی، تمام مشاعرہ چونک گیا۔ ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ لوگ بناتے تھے، آپ خوش ہوتے تھے، جھک جھک کے تسلیمیں کرتے تھے۔

وطن سے بے غل و غش روپیہ چلا آتا تھا۔ ان کی والدہ بے چاری اس خیال سے کہ لڑکا پڑھنے گیا ہے، مولوی بن کے آئے گا، جو کچھ یہ لکھ بھیجتے تھے، بھیج دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے بے فکرے، خوش پوشاک، عیش پسند، مفت خورے آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ انھی لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت پہنچائی۔ آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنچاؤ کیا۔ خانم کا یہ کہنا "نا صاحب! ابھی وہ کم سن ہے" اور ان کی التجا، منت و زاری، بے قراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا تعویذ کی تاثیر اور غم خواروں کی دوا دوش سے پانچ ہزار روپے پر توڑ ہوا۔ اس روپے کے لینے کے لیے آپ کو چند روز کے لیے وطن جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیے۔ بیس پچیس ہزار روپے لے کے لکھنؤ آئے۔ پانچ توڑے گن دیے۔

روپیہ عین المال دیوان جی کی معرفت خانم کے خزانہ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلائے، پانچ سو روپے نذر و نیاز کے نام سے لے مریں۔ خلاصہ یہ میں آپ کے سر منڈھ دی گئی۔ چھ مہینے تک آپ لکھنؤ میں رہے، سو روپے ماہوار دیتے تھے، فرمائش کا ذکر نہیں۔ جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا، خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ دو مہریاں، خدمت گار میرے لیے خاص ملازم ہوئے۔ پھاٹک کے پاس والا کمرا میرے رہنے کے لیے سجا دیا گیا۔ دو چار مرد آدمی، شریف زادے میرے پاس بیٹھنے لگے۔

گل چین اول گوہر مرزا مجھ سے ہر زمانے میں برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اس کی صورت سے جلتی تھیں۔ مجھے محبت تھی، اس لیے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا، جو آمدنی وہاں سے تھی وہ بند ہو گئی۔ بنو بڑھیا ہو چکی تھیں، کوئی پوچھتا نہ تھا، اس لیے گوہر مرزا کے صرف کی خبر

گیری میرے ذمے ہی تھی۔

سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنا رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں۔ رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں میں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ چرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا ناچ کا انتظام اپنے ذمے لے کے مجرے میں انھی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کے اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ رہی ہے، یہ تال دیتے جاتے ہیں۔ ہر سم پر آہ کہتے ہیں، ہر تال پر واہ واہ کہتے ہیں۔ وہ بھاؤ بتا رہی ہے، یہ شرح کرتے جاتے ہیں۔ انھی کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانا ملتا ہے۔ خاطر مدارت اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ انعام و اکرام سوا ملتا ہے۔ اگر کسی رئیس امیر سے ملاقات ہو گئی، انھی کی بدولت اس کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ہم کو چاہنے لگے، ادھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے۔ کبھی یہ فقرہ ہے "صاحب! میں ان کی پابند ہوں، نہیں معلوم آپ سے کیونکر ملتی ہوں۔ اب ان کے آنے کا وقت ہے، مجھے جانے دیجیے۔ وہ تو ہمیشہ کے ہیں، آپ اس طرح کیا نباہیے گا۔"

تماش بین ان سے دبتے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی، یہ حمایت کو مستعد۔ شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات، بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تماش بین ایک طرف، خود نائکہ پر دباؤ رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے رنڈی ان کو پیار کرتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو ان کے ساتھ نکل کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں۔ برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ پانچ سو کے کڑے اتار کے دے دیے اور صبح کو غل مچا دیا کوئی اتار کے لے گیا۔

ایک دفعہ جھالے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دے دی اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کان سے گر گئی۔ اسی طرح ہزاروں روپے کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔

خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔ طبیعت میں سفلہ پن تھا، کسی پر بند نہ تھیں۔

اوروں کا ذکر کیا، خانم صاحب پچاس پچپن برس کے سن میں میر اولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ صورت دار تھے، جوان تھے، کسرتی بدن، اچھی اچھیوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بے چارے غریب آدمی تھے، نان شبینہ کو محتاج۔ خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپے لگا کے شادی کر دی، مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے، گھڑی دو گھڑی کو گھر بھی ہو آتے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب، کوئی ستر برس کا سن، کمر جھکی ہوئی، نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنوا دیتی تھیں۔ افیم، گنا، ریوڑیاں، ان سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، خورشید جان غم زدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔ کیوں! پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے، ان پر غم سوار ہے۔ خانم نے براہ فہمائش کہا: "جاؤ چھوکریو! نہیں معلوم اس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں! جیسی رنڈیاں ویسے ان کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں، جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی، ماں باپ نے شادی ٹھہرائی، آپ مانجھے کا جوڑا پہن کے مجھے دکھانے آئے۔ میں نے مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر دیے، ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو چالیس برس کا زمانہ گزرا، آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو ہے کوئی ایسا تمہارا بھی؟" سب نے سر جھکا لیا۔

(6)

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے

یوں تو بسم اللہ کی مسی میں پہلے پہل ناچی گائی تھی، مگر پہلا مجرا میرا نواب شجاعت علی خاں کے لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی۔ نواب کی بارہ دری کس شان سے سجی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا تھا۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے مسند، تکیے، سامنے رنگ رنگ کے مردنگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ دری بسی ہوئی تھی۔ دھواں دھار حقوں اور گلوریوں کی خوشبو سے دماغ معطر تھے۔ میرا سن کوئی چودہ برس کا ہو گا۔ اس زمانے میں بڑودے سے ایک بائی جی

آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانے کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویّے کان پکڑتے تھے۔ معلومات ایسی کہ پوتھیاں گویا نوک زباں تھیں۔ گلا وہ کہ چار محلے ادھر آواز جائے۔ مگر واہ خانم صاحب! واقعی کیا رنگ محفل دیکھتی تھیں۔ ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی، مگر سمجھ دار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کرتی کیا ہیں۔ بھلا بائی جی کے سامنے اس چھوکری کا رنگ کیسے جمے گا۔

پہلے گت شروع ہوئی۔ اس میں محفل میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی اٹھتی جوانی تھی۔ صورت اچھی نہ تھی۔ مگر اس وقت کی پھرتی، چالاکی، الھڑپن!

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا!

گت تھوڑی ہی دیر ناچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع کرا دی۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھیے دیکھیے اک آن میں کیا ہوتا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ و بالا ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے دوسرا مطلع اک ذرا بتا کے جو گایا، اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکتا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر جھینپتی ہے، آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھیے دیکھیے پھر تیر خطا ہوتا ہے

اس شعر پر یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا نظر نہ اٹھا سکا۔

بت پرستی میں نہ ہو گا کوئی مجھ سا بدنام
جھینپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے

ذرا اس شعر کو سنیے اور قیاس کیجیے عاشق مزاجوں پر اس کا کیا اثر ہوا ہو گا۔

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزا ہوتا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر۔

حال دل ان سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

تمام محفل وجد کے عالم میں تھی۔ ہر شخص محظوظ تھا۔ ہر لفظ پر واہ، ہر سم پر آہاہا۔ ایک ایک شعر آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ گوایا گیا، پھر بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اس غزل پر میرا مجرا موقوف ہوا۔ دوسرے مجرے میں پھر یہی غزل گوائی گئی۔

مرزا رسوا۔ وہ خیر محفل کا جو حال ہوا ہو، از برائے خدا اور جس قدر شعر اس غزل کے یاد ہوں سنا دیجئے۔ یہ کس کی غزل ہے؟

امراؤ۔ اوئی، کیا آپ نہیں جانتے؟

رسوا۔ میں سمجھا!

امراؤ۔ اور شعر سنئے۔

تاب گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

رسوا۔ سبحان اللہ!

امراؤ۔ واقعی قلم توڑ دیا ہے!

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

رسوا۔ یہ بھی خوب کہا ہے!

امراؤ۔ اور سنئے۔

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں
دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

رسوا۔ یہ فلسفہ ہے، اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراؤ۔ اور سنئے۔

شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ
اسی آئینے میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

رسوا۔ یہ تصوف ہے، ہم دنیا کے لوگ ہیں، ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں، مگر شوق اظہار، یہ لفظیں کیونکر مل جایا کرتی ہیں؟

امراؤ۔ مقطع سنئے۔

ہجر میں نلہ و فریاد سے باز آ
ایسی باتوں سے وہ بے درد خفا ہوتا ہے

رسوا۔ مطلع سے مقطع نکال لیا ہے، مقطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔

امراؤ۔ فرصت انہیں کب ملتی ہے۔

پہلے مجرے کے دوسرے دن شام کو بوا حسینی میرے کمرے میں آئیں، ایک خدمت گار ان کے ساتھ تھا۔

بوا حسینی۔ دیکھو امراؤ صاحب! یہ کیا کہتا ہے۔

اتنا کہہ کے بوا حسینی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

خدمت گار۔ (سلام کر کے) مجھے نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے، جو کل شب کو محفل میں زرد مندیل سر پر رکھے دولہا کے داہنی طرف بیٹھے تھے۔ اور فرمایا ہے کہ میں کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ جس وقت میں آؤں، اس وقت کوئی اور نہ ہو۔ اور اس غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی۔

میں۔ نواب صاحب کو میری تسلیمات کہنا۔ شام کو جب چاہیے، تشریف لائیے، تخلیہ ہو جائے گا۔ غزل کے لئے کل دن کو کسی وقت آنا لکھ دوں گی۔

دوسرے دن پہر دن چڑھے خدمت گار آیا۔ میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ غزل کی نقل میں نے کر رکھی تھی، تخلیہ اس کے حوالے کی۔ اس نے پانچ اشرفیاں کمر سے نکال کے مجھے دیں اور کہا کہ نواب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لائق تو نہیں مگر خیر پان کھانے کے لئے میری طرف سے قبول کیجئے۔ آج شب کو چراغ جلنے کے بعد میں ضرور آؤں گا۔ خدمت گار سلام کر کے رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ بوا حسینی کو بلا کے یہ اشرفیاں دے دوں، وہ خانم کے حوالے کریں۔ پھر ایک دفعہ جو اشرفیوں کی طرف دیکھا، چمکتی چمکتی نئے گھن کی اشرفیاں بھلا میرے دل سے کب نکلتی تھیں! اس وقت صندوقچہ دندوقچہ تو میرے پاس نہ تھا پلنگ کے پائے کے نیچے

دبادیں۔

مرزار سوا صاحب! میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ اسے کوئی چاہے۔ یہ نہ سمجھیئے گا کہ یہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے، بلکہ عنفوان شباب سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اس کا نشو و نما ہوتا رہتا ہے۔ جس قدر سن بڑھتا ہے اسی قدر یہ خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گوہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی۔ اس کی چاہت میں ایک بات کی کمی تھی جسے میرا دل ڈھونڈتا تھا۔ مردانہ ہمت کو اس کی طینت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پنا اس کے خمیر میں داخل تھا۔ وہ جو کچھ پاتا تھا مجھ سے چھین جھپٹ کے لے لیتا تھا۔ خود ایک روپے کے سوا، جس کا ذکر کر چکی ہوں، کبھی کچھ نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈتا تھا جو میری ناز برداری کرے، روپیہ خرچ، کھلائے پلائے۔ نواب سلطان صاحب (نواب صاحب کا یہی نام آدمی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے۔ ان کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا جس پر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور اظہار عشق پسند ہے۔ بیشک پسند ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو۔ جو لوگ رنڈیوں کا گھنا تاکتے ہوئے آتے ہیں، جن کے ہر کنائے سے یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو، خدا کے لئے چاہو، اور ہمارے گھر پڑ جاؤ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے، ہمیں دے دو اور ہمارے گھر کی ماماگیری کرو، روٹیاں پکا پکا کے کھلاؤ، ہماری اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ ہر شخص کا حسن حضرت یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتی ہے، مگر اس محبت میں اکثر اغراض ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یہ صرف قصے کہانیوں میں سنی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یکطرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے اسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے، مگر اس کو خلل دماغ سمجھنا چاہیے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہوں۔

دوسرے دن شب کو نواب صاحب تشریف لائے۔ بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد تعین اخراجات ہو کر کمرے میں تخلیہ ہو گیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب نے ملازم نہیں رکھا صرف یہ طے ہوا ہے کہ کبھی رات کو گھڑی دو گھڑی کے لئے آیا کریں گے۔ نواب صاحب بہت ہی کم سخن بھولے آدمی تھے۔ سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی تھی۔ ماں باپ کے دباؤ میں

تھے۔ دنیا کے جعل فریب سے بالکل آگاہ نہ تھے۔ اظہار عشق خدمت گار کی زبانی ہو چکا تھا۔ ورنہ نواب صاحب کو اس میں بھی کسی قدر مشکل ہوتی، مگر میں نے تھوڑی دیر میں بے تکلف بنالیا۔

بہت سی لگاوٹ کی باتیں کیں، بالکل عاشق زار بن گئی۔ اس میں کچھ سچ تھا، کچھ جھوٹ۔ سچ تو اس لئے تھا کہ نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی کہ ایک عورت خواہ وہ کیسی ہی سخت دل کیوں نہ ہو ان پر مائل نہ ہو جائے۔ گوری گوری رنگت جیسے گلاب کا پھول، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، خوبصورت بتیسی، گھونگر والے بال، کتابی چہرہ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں، بھرے بھرے بازو، مچھلیاں پڑی ہوئی چوڑی کلائیاں، بلند بالا کسرتی بدن، خدا نے سر سے لے کے پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس پر بھولی بھالی باتیں، بات بات میں عاشقانہ شعر جن میں سے اکثر انہی کی تصنیف تھے۔ شعر پڑھنے میں ہواؤ ٹوٹا ہوا تھا۔ خاندانی شاعر تھے۔ مشاعروں میں اپنے والد کے ساتھ غزل پڑھتے تھے۔ شاعروں کو کیسا ہی عاشقانہ شعر ہو، کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھینپ نہیں ہوتی۔ خورد بزرگ کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کر سکتے ہوں، مگر شعر پڑھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔ شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ان کا مطلب ادا کیا جائے تو منہ سے کہتے نہ بنے۔ غرضیکہ اس شب کو بڑے مزے کی صحبت تھی۔

نواب:۔ آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کر لیا ہے کہ بغیر آپ کے دیکھے چین ہی نہیں آتا۔

میں:۔ یہ سب آپ کی قدردانی ہے، ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔

"ایاز قدر خود بشناس۔ من آنم کہ من دانم"

نواب:۔ اوہو! آپ تو خواندہ معلوم ہوتی ہیں۔

میں:۔ جی ہاں، کچھ شد بد پڑھا تو ہے۔

نواب:۔ اور لکھنا بھی جانتی ہو؟

میں:۔ جی ہاں لکھ بھی لیتی ہوں۔

نواب:۔ تو وہ غزل آپ ہی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے؟

میں مسکرا کے چپ ہو رہی۔

نواب:۔ واللہ کیا پیارا خط ہے! اس بات سے تو بہت ہی جی خوش ہوا۔ خدمت گاروں سے دل کا حال کہتے نہیں بنتا، اب زبان قلم سے گفتگو ہوا کرے گی۔ ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے، جہاں تک ہو کسی ایسے معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔

نہ غیروں کی وساطت ہو، نہ یاروں کی شماتت ہو
جو ہیں آپس کی باتیں راز دار ان کے ہمیں تم ہو

میں:۔ یہ آپ ہی کا شعر ہے؟
نواب:۔ جی نہیں، والد مرحوم نے فرمایا ہے۔
میں:۔ کیا خوب فرمایا ہے!
نواب:۔ ماشاءاللہ آپ کو شاعری کا مذاق بھی ہے۔

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے
حسن تقریر بھی ہو، خوبی تحریر بھی ہو

میں:۔ کس کا شعر ہے؟
نواب:۔ ان ہی کا۔
میں:۔ کیا خوب فرمایا!
نواب:۔ جی ہاں وہ ایسا ہی فرماتے تھے، مگر واللہ آپ کی شان کے لائق ہے۔
میں:۔ یہ فقط آپ کی عنایت ہے۔

ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

نواب:۔ واہ کیا صاف صاف شعر ہے!
میں:۔ تسلیم!
نواب:۔ یہ کہیئے آپ شعر بھی کہتی ہیں۔
میں:۔ جی نہیں، آپ ایسے قدر دانوں سے کہوا لیتی ہوں۔ اس بات پر نواب صاحب پہلے تو اک ذرا چیں بہ جبیں ہوئے، پھر مسکراتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑے۔
نواب:۔ خوب کہی! جی ہاں اکثر رنڈیوں کا دستور ہے کہ یاروں سے شعر کہوا کے اپنے نام سے پڑھا کرتی ہیں۔
میں:۔ آپ رنڈیوں کو کہیئے۔ کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟
نواب:۔ واللہ سچ ہے۔ والد مرحوم کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب ہیں جنہوں نے کبھی ایک مصرع نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھنے کو مستعد۔ اکثر والد ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میری غزل میں شعر زائد ہوئے، چھانٹ دیئے۔ میں کہتا ہوں

کہ اس میں لطف ہی کیا ہے۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے حضرت استاد کے بنائے ہوئے شعر دیوان سے نکال ڈالے۔ جھوٹی تعریفوں سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہو گی۔

میں:۔ خدا جانے۔ یہ بھی ایک ہوس ہے اور بڑی ہوس۔
نواب:۔ اچھا تو اس غزل کا اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھیئے۔
میں:۔ فرض ہے ضبط نالہ و فریاد
جس سے نا خوش ہو تم وہ عادت کیا
نواب:۔ کیا شعر ہے! پھر پڑھیئے۔ واللہ کیا نئی بات کہی ہے!
میں:۔ (شعر دوبارہ پڑھ کے) تسلیم! آپ قدر دانی کرتے ہیں۔
نواب:۔ شعر ہی اچھا ہے۔ اور کوئی شعر پڑھیئے۔
میں:۔ اس طرح میں میری غزل نہیں۔ یہ دو شعر ابھی کہے ہیں۔
نواب:۔ یہ اور طرہ ہوا۔ فی البدیہہ اور ایسے شعر! اچھا اور کسی غزل کے شعر پڑھیئے۔
میں:۔ اب آپ ارشاد کیجئے۔ اسی لئے میں نے سبقت کی تھی۔
نواب:۔ میں پڑھے دیتا ہوں، مگر آپ کو بھی غزل پڑھنا ہو گی۔

اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا سن، سیاہ رنگت، کر بڑی داڑھی، ترچھی پگڑی باندھے، کمر بندھی ہوئی، کٹار لگی ہوئی، کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو دبا کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے میری طرف دیکھا، میں نے سر جھکا لیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کہاں تو نواب سے یہ اقرار تھا کہ بالکل تخلیہ ہو گا، کمرے میں کوئی نہ ہو گا۔ کس مزے کی گفتگو، کیا ستھرا مذاق تھا، کیا راز و نیاز ہو رہا تھا، کہاں یہ بلائے مہیب نازل ہوئی۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

ان صاحب نے بیٹھتے ہی نواب صاحب کی طرف گھور گھور کے دیکھنا شروع کیا جیسے کوئی اپنے باپ کے قاتل کو دیکھتا ہو۔ گھڑی گھڑی کٹار پر ہاتھ جاتا تھا۔ میں تو دل میں سہمی جاتی تھی۔ یا الٰہی یہ کیا آفت ناگہانی آ گئی۔ دیکھیئے کیا ہوتا ہے۔ نواب اپنی طرف کھنچے ہوئے بیٹھے ہیں، تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں۔

ہائے کیا مزے کی صحبت تھی، اس کم بخت نے کیا خلل ڈالا۔ نواب ابھی غزل پڑھنے کو تھے،

اس کے بعد میں کچھ کہتی۔ نواب تعریفیں کرتے کیا دل خوش ہوتا۔ آج ہی تو ایک ایسا قدر دان ملا تھا جسے مدتوں سے میرا دل ڈھونڈتا تھا اور آج ہی آفت کا سامنا ہوا۔ خدا اس موئے کو جلدی یہاں سے اڑائے۔ یہ خیالات میرے دل میں تھے اور وہ خون خوار صورت آنکھوں کے سامنے تھی جس کے دیکھنے سے میرا دل لرزا جاتا تھا۔ یہ تو میری جان کو گویا دلاور خان ہو گیا۔ بار بار اندیشہ تھا کہ کٹار جو اس کی کمر میں ہے یا میرے کلیجے کے پار ہو گی یا خدانخواستہ نواب کو کچھ گزند پہنچائے گی۔ دل ہی دل میں کوستی تھی، خدا غارت کرے، موا کہاں سے اس وقت آگیا۔

آخر مجھ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا، بوا حسینی کو آواز دی۔ انہوں نے آکے جو یہ ماجرا دیکھا، سمجھ گئیں۔

بوا حسینی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ان صاحب کو کچھ جانتی بھی تھیں۔

بوا حسینی:۔ خان صاحب! مجھے کچھ آپ سے عرض کرنا ہے، ادھر تشریف لائیے۔

خان صاحب:۔ جو کچھ کہنا ہے وہیں سے کہو۔ ہم لوگ کہیں بیٹھ کے اٹھتے نہیں۔

بوا حسینی:۔ تو خان صاحب کوئی زبردستی ہے؟

خان صاحب:۔ اس میں زبردستی کیا۔ رنڈی کے مکان پر کسی کا اجارہ نہیں، اور اگر زبردستی ہے تو زبردستی ہی سہی۔ ہم تو نہیں اٹھنے کے۔ دیکھیں تو ہمیں کون۔۔۔۔۔ اٹھا دیتا ہے۔

بوا حسینی:۔ اجارہ کیوں نہیں۔ جو زر خرچ کا، رنڈی اسی کی ہے۔ پھر اور کوئی اس وقت نہیں آسکتا۔

خان صاحب:۔ تو کیا زر خرچنے کو ہم نابر ہیں؟

بوا حسینی:۔ اچھا اس وقت اس کا کوئی موقع نہیں۔ اور کسی وقت تشریف لائیے گا۔

خان صاحب:۔ عورت کچھ واہی ہوئی ہے۔ کہہ دیا ہم نہیں اٹھیں گے۔

میں نے دیکھا کہ نواب کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا، مگر ابھی تک چپکے بیٹھے ہیں، کچھ منہ سے نہیں بولتے۔

بوا حسینی:۔ بیٹی اچھا تو ادھر اٹھ کے چلی آ۔ نواب صاحب! آپ کے آرام کا وقت ہے۔ کوٹھے پر تشریف لے جائیے۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نگوڑ مارے نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب کیا کروں!

نواب:۔ خان صاحب! رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجئے، اسی میں خیریت ہے۔ بہت کچھ زیادتیاں کر چکے ہیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا، صرف اس خیال سے کہ رنڈی کے مکان پر تھکک کرنا

اچھا نہیں، مگر اب۔۔۔۔۔

خان صاحب:۔ مگر اب تم کیا کر سکتے ہو۔ دیکھیں تو کون۔۔۔۔۔ رنڈی کا ہاتھ چھڑواتا ہے۔

میں:۔ (زور سے ہاتھ جھٹک کر) اچھا تو ہاتھ چھوڑ دیجئے، میں کہیں جاتی نہیں۔ (واقعی میں نواب صاحب کو چھوڑ کے ہرگز نہ جاتی)۔

خان صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

نواب:۔ میں کہے جاتا ہوں کہ ذرا زبان سنبھال کے گفتگو کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شریفوں کی صحبت نہیں اٹھائی۔

خان صاحب:۔ خیر تم نے تو شریفوں کی صحبت اٹھائی ہے، جو کچھ ہو سکے کر لو۔

نواب:۔ یہ تو معلوم ہوا کہ آپ لڑنے پر آمادہ ہیں، مگر رنڈی کا مکان کوئی اکھاڑا نہیں ہے، نہ میدان۔ بہتر ہے اس کو کسی اور وقت پر موقوف رکھئے اور اب تشریف لے جائیے۔ نہیں تو۔۔۔۔۔

خان صاحب:۔ نہیں تو تم مجھے گھول کر پی جاؤ گے؟ تشریف لے جائیے کی خوب کہی، تم ہی کیوں نہیں چلے جاتے؟

نواب:۔ خان صاحب! جناب امیر کی قسم! میں بہت طرح دیتا ہوں، اس لئے کہ مجھے کسی قدر اپنی عزت کا خیال ہے۔ والدین، عزیز، دوست، جو سنے گا نام رکھے گا، ورنہ آپ کو ابھی ان گستاخیوں کا مزا چکھا دیتا۔ پھر میں آپ سے کہتا ہوں کہ بے فائدہ حجت نہ کیجئے، تشریف لے جائیے۔

خان صاحب:۔ رنڈی کے گھر پر تو آتے ہو اور اماں جان سے ڈرتے ہو؟ گستاخیاں کیسی؟ تمہارے باپ کا نوکر ہوں؟ تم اپنے گھر کے رئیس زادے ہو تو ہوا کرو۔ رنڈی کے مکان پر تم بیٹھے ہو، ہم بھی بیٹھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا، جائیں گے۔ تم خود بے کار حجت کرتے ہو۔ کسی کو اٹھاتے نہیں دیکھا۔

نواب:۔ اٹھا دینا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ خدمت گاروں کو آواز دیتا ہوں تو آپ کی گردن میں ہاتھ دے کے ابھی نکالے دیتے ہیں۔

خان صاحب:۔ خدمت گاروں کے بل پر نہ بھولنا، یہ کٹار بھی دیکھا ہے؟

نواب:۔ ایسے بہت کٹار دیکھے ہیں۔ جو وقت پر کام آوے وہ کٹار ہے۔ آپ کی کٹار میان سے

نکلتی رہے گی، یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا۔

خان صاحب۔ لے اب تمہی گھر کو جاؤ، اماں جان یاد کرتی ہوں گی۔

میں دیکھ رہی تھی کہ نواب صاحب کا چہرہ بالکل متغیر ہو گیا ہے۔ مارے غصے کے تھر تھر کانپ رہے تھے، مگر واہ ری شرافت! اس پاجی نے کس قدر سخت سست کہا، مگر یہ آپ ہی آپ کر کے بات کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے پہلے تو یہ خیال تھا کہ نواب ڈر گئے، مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا، اسی لئے طرح دے رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ معاملہ سہولت سے رفع دفع ہو جائے، مگر اس پاجی کی بد زبانی بڑھتی جاتی تھی۔ جس قدر نواب طرح دیتے تھے، وہ اور شیر ہوا جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا۔

نواب۔ اچھا اٹھئے خان صاحب! ہم آپ دونوں یہاں سے چلے چلیں، عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

خان صاحب۔ (قہقہہ مار کے) صاحب زادے! ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ! کہیں کوئی چرکا کھا جاؤ گے تو اماں جان روتی پھریں گی۔

نواب۔ مردود! اب تیری بد زبانیاں حد کو پہنچ گئی ہیں۔ دیکھ اب تجھے تیری گستاخی کی سزا دیتا ہوں۔

یہ کہتے ہی نواب نے دولائی کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں طمنچہ تھا، دن سے داغ دیا۔ خان صاحب دھم سے گر پڑے، میں سن سی ہو گئی۔ فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا۔ بوا حسینی جہاں کھڑی تھیں کھڑی رہ گئیں۔ طمنچے کی آواز سن کے خانم صاحب، مرزا صاحب، میر صاحب، خورشید جان، امیر جان، بسم اللہ جان، خدمت گار، مہریاں، تو، میں سب دوڑے آئے۔ میرے کمرے میں بھیڑ ہو گئی۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے۔ اتنے میں شمشیر خاں (ایک ادھیڑ سا آدمی، نواب صاحب کا ملازم) نے لپک کر نواب کے ہاتھ سے طمنچہ لیا اور کہا "لے اب حضور گھر تشریف لے جائیں، میں سمجھ لوں گا۔"

نواب۔ میں نہیں جاتا۔ اب جو کچھ ہوا، ہوا، اور جو کچھ ہونا ہو گا ہو جائے گا۔

شمشیر خاں۔ (کمر سے چھری نکال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم! ابھی اپنے کلیجے میں مار لوں گا نہیں تو برائے خدا آپ چلے جائیں۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا خان صاحب کے گولی کہاں لگی۔ معلوم ہوا کہ جان کی خیریت ہے، بازو میں لگی تھی، اس پار ہو گئی۔

شمشیر خاں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مردود کا ہوا ہی کیا ہے۔ آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں۔

بارے نواب صاحب بھی کچھ سمجھ کے اٹھے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے ساتھ کیا گیا۔ خانم نے اسی وقت مرزا علی رضا بیگ کو بلوا بھیجا۔ وہ چوک میں ہی تھے۔ فوراً چلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لے جا کر نہیں معلوم کیا کان میں پھونکا، وہاں سے آئے تو یہ کہتے ہوئے آئے۔

مرزا۔ ہو گا! پھینک دو مردود کو کمرے کے نیچے، سمجھ لیا جائے گا۔

خیر، خان صاحب کو کمرے کے نیچے تو نہیں پھینکا، بازو پر پٹی باندھی، ڈولی بلوائی گئی۔ خان صاحب کو بھی کسی قدر ہوش آگیا تھا۔ مکان کا پتا پوچھا، معلوم ہوا مرغ خانے میں رہتے ہیں۔ ڈولی میں بٹھا کے ان کے گھر بھجوا دیا۔ کہاروں کو سمجھا دیا تھا مکان کے قریب کہیں پر اتار کے چلے آنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے، نہ ان کا آدمی آیا۔ مجھے ان سے محبت سی ہو گئی تھی۔ یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئیں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا بھی۔ وضع دار آدمی تھے، پہلے ہی جب وہ آئے تھے، آدمی کی زبانی پیش تر بہت تاکید تخلئے کے لئے کر دی تھی۔ بوا حسینی نے اقرار کر لیا تھا کہ کوئی نہ آنے پائے گا۔ مگر اتنی چوک ہو گئی کہ دروازے پر کسی کو نہ بٹھا دیا۔ خان صاحب از غیبی ڈھیلا خدا جانے کہاں سے آن پڑے، سارا کھیل بگڑ گیا۔ اتفاق سے چار پانچ دن کے بعد ایک برات میں میرا مجرا آگیا تھا۔ وہاں نواب صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ میرا پہلا مجرا نو بجے رات کو شروع ہونا تھا۔ محفل میں بات کرنا کیسا، اشارے کنائے کا بھی موقع نہ تھا۔ ایک لڑکا گورا گورا، کوئی نو دس برس کا سن، بھاری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بیٹھا تھا، کسی ضرورت سے اٹھا۔ میرا مجرا ہو چکا تھا، علیحدہ کمرے میں پیشواز اتار رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلوایا، پاس بٹھایا، ایک پان لگا کے دیا، پوچھا۔

میں۔ سلطان صاحب کو جانتے ہو؟

لڑکا۔ کون سلطان صاحب؟

میں۔ وہ جو دلہا کے پاس تمہارے برابر بیٹھے تھے۔

لڑکا۔ (تیوری چڑھا کے) واہ! وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں، انہیں ذرا سلطان صاحب نہ کہنا۔

میں۔ اچھا تو ہم کچھ دیں، انہیں دو گے؟

لڑکا۔ کہیں مجھ پر خفا نہ ہوں؟

میں۔ خفا نہیں ہوں گے۔

لڑکا۔ اور دو گی کیا، پان؟

میں۔ پان نہیں، پان تو ان کے خاص دان میں ہوں گے۔ اے لو، یہ کاغذ دے دینا۔

ایک پرچہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا، میں نے اس پر کوئلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

مدتوں سے ہم ہیں محروم عتاب
بزم میں آج ان کو چھیڑا چاہیے

اور سمجھا دیا کہ یہ کاغذ ان کی آنکھ بچا کے سامنے رکھ دینا، ان کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ میں کمرے کے پٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا، پڑھا۔ پہلے تو چہرے پر کچھ فکر کے آثار ظاہر ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر تک پرچے کو غور سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد مسکرا کے جیب میں رکھ لیا۔ شمشیر خان کو اشارے سے بلایا، اس کے کان میں کچھ چپکے سے کہا، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شمشیر خاں ہمارے کمرے میں آیا۔

شمشیر خان۔ نواب صاحب نے کہا ہے کہ اس پرچے کا جواب ہم گھر پر جا کر لکھ بھیجیں گے۔

دوسرا مجرا صبح کو ہوا تھا، اس وقت سلطان صاحب محفل میں نہ تھے۔ ان کے بغیر محفل مجھے سونی معلوم ہوتی تھی، گانے میں دل نہ لگتا تھا۔ آخر جوں توں مجرا ختم ہوا، میں گھر پر آئی۔ اس دن، دن بھر شمشیر خان کا انتظار رہا۔ بارے چراغ جلنے کے بعد وہ آیا، نواب کا رقعہ دیا۔ مضمون یہ تھا۔

"تمہارے شعر نے اس آگ کو، جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی، کرید کر بھڑکا دیا، واقعی مجھے تم سے محبت ہے، مگر اپنی وضع سے مجبور ہوں۔ تمہارے مکان پر اب ہرگز نہ آؤں گا۔ میرے ایک بے تکلف دوست نواز گنج میں رہتے ہیں، کل میں تمہیں وہاں بلوا بھیجوں گا، بہ شرط فرصت چلی آنا۔ یہی ایک صورت ملنے کی ہے، وہ بھی نو دس بجے رات تک۔

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا
یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں

سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہیں آئے۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ نواز گنج میں نواب بنے خاں کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے۔ عجب لطف کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوا، کبھی نواب بنے صاحب طبلہ بجانے لگے، میں گانے لگی۔ سلطان صاحب خود بھی گاتے تھے۔ تال سم سے تو ایسے واقف نہ تھے، مگر اپنی غزل آپ خوب گا لیتے تھے۔

کچھ اس طرح سے نظر بازیوں کی مشق بڑھی
میں ان کو اور وہ میری نظر کو دیکھتے ہیں

جب یاد آتا ہے، اس جلسے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرمیوں کے دن، شب مہتاب کا عالم، صحن باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے، گاؤ تکئے لگے ہوئے۔ سامان عیش و نشاط مہیا، باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے، بیلے چنبیلی کی مہک سے دماغ معطر، خوشبو دار گلوریاں، بسے ہوئے حقے، تخلئے کا جلسہ، آپس کی چہلیں، بے تکلفی کی باتیں! ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا، انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے جلسے بہت جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے، بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی۔

لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی۔ دونوں کے مذاق کچھ ایسے ملتے ہوئے تھے کہ عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شعر و سخن کا شوق تھا اور مجھے بھی بچپن سے اس کی لت ہے۔ سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی سبب سے مجھ سے محبت کرتے تھے۔ بات بات میں وہ شعر پڑھتے تھے۔ میں جواب دیتی تھی۔ مگر افسوس! فلک تفرقہ انداز نے وہ جلسہ بہت ہی جلد برہم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر
ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کی برہم ہو گئیں

رسوا۔ اچھا وہ سب کچھ تو ہوا۔ آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے بہت سے جلسے برہم ہو گئے ہوں گے۔

امراؤ۔ واہ مرزا صاحب! تو کیا میرے دشمن بھن پیرے ہیں، یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، مگر سلامتی سے جہاں آپ تشریف لے گئیں، صفائی ہو گئی۔

امراؤ۔ آپ جو چاہے کہئے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی روداد ہرگز بیان نہ کرتی۔ خیر اب تو قصور ہوا۔

رسوا۔ قصور! یہی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کام کیا جس سے آپ کا نام دنیا میں رہ

جائے گا۔ خواہ نیک نامی کے ساتھ خواہ بدنامی کے ساتھ۔ اس کا ذمہ میں نہیں کرتا۔ اب اس بات کو یہیں تک رہنے دیجئے۔ ذرا اس غزل کے دو تین شعر اور یاد ہوں تو پڑھ دیجئے۔

امراؤ۔ آپ بھی آدمی کو خوب بناتے ہیں۔

رسوا۔ خیر بگاڑتا تو نہیں؟ اچھا آپ شعر پڑھئے۔

امراؤ۔ اچھا سنئے۔ ایک مطلع اور دو شعر اور یاد ہیں۔

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں
طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں
وہ جو بیٹھے سوگ میں زلف رسا کھولے ہوئے
حسرتیں میری شریک بزم ماتم ہو گئیں
ہم نشیں ! دیکھی نحوست داستان ہجر کی
صحبتیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

اسی زمانے میں نواب جعفر علی خان صاحب کی ملازم ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔ منہ میں ایک دانت نہ تھا، پشت خم ہو گئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا، مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ ان کا کیچلی کا انگرکھا اور گلبدن کا پاجامہ، لال نیفہ، مصالح دار ٹوپی، کاکلیں بنی ہوئی، عمر بھر نہ بھولیں گی۔

آپ کہئے گا کہ اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا۔ سنئے مرزا صاحب! اس زمانے کا فیشن یہی تھا۔ کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہو گا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔ نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان و شوکت کے تھے، وہاں سلامتی منانے کے لئے جلوسوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم تھا۔ پچھتر روپے ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹے کے لئے مصاحبت کر کے چلی آتی تھی۔ اور تکلف سنئے، نواب بوڑھے ہو گئے تھے، مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں۔ اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی، کھلائی آ کے زبردستی اٹھا لے جاتی تھی۔ نواب صاحب کی والدہ زندہ تھیں، ان سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہو۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی، مگر سوائے عشرہ محرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ آپ تو ہنستے ہوں گے۔ مگر میرے دل سے پوچھئے، بیشک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس

بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے دل لوٹ جاتا تھا۔ فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال ان کے سامنے کوئی گا سکے۔ اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے، سندی سوز میر علی صاحب کے ان کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سینکڑوں سوز یاد ہو گئے، دور دور میری شہرت ہو گئی۔

خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ امام باڑے میں پنکھے، شیشہ آلات، جو شے تھی، نادر تھی۔ عشرہ محرم میں دس دن تک روز مجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سینکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ شکنی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوز خواں میرے سامنے منہ نہ کھول سکتے تھے۔ اسی سوز خوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نوحہ خوانی کی تعریف کی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔ مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔ شب کو اپنے امام باڑے میں ماتم کر کے مجھے در دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کوئی دو بجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔

جس زمانے میں بسم اللہ کی مسی ہوئی تھی، نواب چھبن صاحب کے چچا کربلائے معلیٰ گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی مسی کو کوئی چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ وہ کربلا سے تشریف لائے۔ ان کی لڑکی کی نواب کے ساتھ منگنی ہو گئی تھی، انہوں نے آتے کے ساتھ ہی شادی پر زور دیا۔ نواب صاحب بسم اللہ جان پر مرتے تھے۔ ادھر بسم اللہ جان نے گھر میں بیٹھ جانے کا فقرہ دے رکھا تھا، صاف انکار کر دیا۔ مگر انکار کب چلتا تھا۔ شاہی زمانہ، انکی لڑکی پر کالی چڑھ چکی تھی، وہ کب مانتے۔ ایک شب کو نواب کے مکان پر جلسہ ہے۔ مصاحبین جمع ہیں۔ بسم اللہ نواب کے پہلو میں بیٹھی ہیں اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔

سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی ہوں، نواب صاحب طنبورہ چھیڑ رہے ہیں۔ نواب صاحب کے مصاحب خاص دلبر حسین طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خبردار نے خبر دی کہ بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لاتے ہیں۔ نواب صاحب یہ سمجھے کہ آئے ہیں تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس جائیں گے۔ ہم سب کو بھی یہی خیال تھا۔ مگر وہ درانا دیوان خانے میں گھسے چلے آئے۔ آ کے جو دیکھا تو یہ جلسہ ہے۔ آگ بگولا ہو گئے۔ خیر ان کے آنے کے ساتھ ہی گانا تو موقوف ہوا، نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

بڑے نواب:۔ خیر اب تعظیم و تکریم کو تو رہنے دیجئے، مجھے ایک امر ضروری عرض کرنا تھا، ورنہ آپ کے عیش میں خلل انداز نہ ہوتا۔

نواب:۔ ارشاد!

بڑے نواب:۔ آپ بچے ہیں، آپ کو معلوم نہیں میرے چھوٹے بھائی احمد علی خان مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا اس وجہ سے آپ محجوب الارث ہیں۔ کوئی حق آپ کا اس جائیداد میں نہیں ہے جس پر آپ قابض و متصرف ہیں۔ بیشک والدہ مرحومہ نے آپ کو بیٹا کیا تھا اور مرتے وقت آپ کے نام وصیت بھی کر گئی ہیں، مگر وہ کوئی چیز نہیں۔ صرف ایک ثلث جائیداد بنا بر اس وصیت نامے کے آپ کو مل سکتی ہے، مگر لوگوں کے کہنے سننے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ثلث سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔ خیر ثلث کا مجھ کو دعویٰ نہیں اور ثلث سے زیادہ کی نسبت آپ سے باز پرس نہ کی جائے گی اس لئے کہ آپ میرے خون جگر ہیں۔ (اس کے بعد بڑے نواب صاحب آب دیدہ ہو گئے، مگر پھر ضبط کر کے کہا) آپ اس جائیداد پر مدت العمر قابض و متصرف رہتے، میری ذاتی جائیداد میرے خرچ کے لئے کفالت کرتی ہے اور اس جائیداد کے بھی آپ ہی وارث ہوتے۔ مگر آپ کی بد وضعی نے مجھے مجبور کیا کہ آپ کو اس جائیداد موروثی سے بے دخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں مٹانے کے لئے نہیں ہے۔ منصف الدولہ کے آدمی میرے ہم راہ ہیں، اسی وقت تمام گھر کا تعلیقہ ہو گا۔ آپ فوراً مع ارباب نشاط یہاں سے تشریف لے جایئے۔

نواب:۔ تو اس جائیداد میں میرا کوئی حق نہیں؟

بڑے نواب:۔ جی نہیں۔

نواب:۔ اچھا ایک ثلث پانے کا مستحق ہوں؟

بڑے نواب:۔ وہ آپ لے چکے۔ اور اگر آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو در دولت پر تشریف لے چلئے۔ میرے نزدیک آپ کا ایک حبہ نہیں۔

نواب:۔ تو اچھا اماں جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔

بڑے نواب:۔ وہ آپ سے دست بردار ہوتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ کربلا جائیں گی۔

نواب:۔ اچھا تو میں کہاں جاؤں؟

بڑے نواب:۔ یہ میں کیا جانوں! یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین مشغولہ اور معشوقہ سے دریافت کیجئے۔

نواب:۔ اچھا تو میرے کپڑے، اسباب وغیرہ تو دے دیجئے۔

بڑے نواب:۔ اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے۔ نہ آپ کے ذاتی بنوائے ہوئے کپڑے ہیں۔

اس کے بعد منصف الدولہ کے آدمی دیوان خانے میں آ گئے، نواب صاحب کو مع مصاحبین و ارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈولیاں کرایہ کیں، چوک کا راستہ لیا، مصاحبین اور نواب صاحب خدا جانے کہاں گئے۔

سنا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کر کے راستے ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب کے والد کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جس کو نواب صاحب نے بیکار سمجھ کر نوکری سے برطرف کر دیا تھا، راستے میں ملا۔ اس نے حال دریافت کیا اور ان کی بے کسی پر ترس کھا کے اپنے گھر لے آیا۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسنو، نواب صاحب کے خاص کارکن، مصاحب، دوست، جاں نثار، جہاں نواب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے، تشریف رکھتے ہیں۔ یہ آج ہی کچھ نہیں آئے ہیں، پہلے بھی نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے، مگر آج کھلے خزانے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت احدے و بے مزاحمت غیرے قابض و متصرف ہیں۔ نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو:۔ دیکھو بسم اللہ جان! ۔۔۔۔۔ نواب سے تو اب سے کوئی امید نہ رکھو۔ میں، جو کچھ کہو، وہ دے دیا کروں، غریب آدمی ہوں، زیادہ تو میری اوقات نہیں۔ جو نواب صاحب دیتے تھے، اس کا نصف بھی مجھ سے ممکن نہیں، مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا۔

بسم اللہ:۔ غریب آدمی ہوں؟ یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کاٹ کے گھر میں بھر لی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاؤ تو نومن چربی سے کم نہ نکلے۔

حسنو:۔ ہیں ہیں! تم تو ایسا نہ کہو۔ وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھر لیتا۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا؟

بسم اللہ:۔ آپ کی والدہ توافرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ والیوں میں تھیں نا؟

میر حسنو۔ (جھینپ کر) وہ جو کوئی ہوں، جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا تو زیور چھوڑ کر مری ہیں۔

بسم اللہ۔ وہ آپ کی بیوی لے کے یار کے ساتھ نکل گئیں، آپ کے پلے کیا پڑا؟ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریئے، مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے۔

حسنو۔ تو والد کے پاس کچھ کم تھا؟

بسم اللہ۔ والد آپ کے نواب حسن علی خان کے چڑی ماروں میں تھے۔

حسنو۔ چڑی ماروں میں؟

بسم اللہ۔ اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی۔

حسنو۔ مرغ بازوں میں تھے؟

بسم اللہ۔ اچھا وہ بٹیر باز سہی، تھا تو چڑیا کا کام۔

حسنو۔ لیجئے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔

بسم اللہ۔ میں کھری کہتی ہوں، اسی سے بری مشہور ہوں۔ اور کہتی بھی نہ، تمہارے چھچھورے پن پر جی جل گیا۔ یوں تم آتے تھے، میں نے کبھی منع نہیں کیا۔ آج ہی تو نواب پر یہ واردات ہوئی، آج ہی آپ نے میرے منہ در منہ نوکری کا پیغام دے دیا۔ ہوش کی دوا کرو۔ تم کیا نوکر رکھو گے۔ یہی ایک مہینہ، دو مہینہ، تین مہینہ سہی، بس!

حسنو۔ چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں؟

بسم اللہ۔ زبان سے؟

حسنو۔ یہ لو (سونے کے جڑاؤ کڑے کی جوڑی کمر سے نکال کے) تمہارے نزدیک کتنے کا مال ہو گا؟

بسم اللہ۔ میں دیکھوں؟ (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کے اپنے ہاتھوں میں پہن لئے) کل چھتا مل کے لڑکے کو دکھلاؤں گی، مگر بنے اچھے ہیں۔ اچھا تو اب آپ تشریف لے جایئے۔ اس وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے، ٹھہر نہیں سکتی، کل اسی وقت آیئے۔

حسنو۔ تو کڑے اتار دیجئے۔

بسم اللہ۔ یا اللہ! کوئی چوروں سے بھوار ہے؟ میں تمہارے کڑے کچھ کھانہ لوں گی۔ اس وقت میرے ہاتھ میں سادی پٹریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اماں جان سے چھپ کے جاتی ہوں، ان

سے کڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی، اس لئے ذرا ہاتھ میں ڈال لئے، صبح کو لے جانا۔

حسنو۔ کڑے دے دیجئے، میرے نہیں ہیں، نہیں تو کیا بات تھی، تم پر سے صدقے کئے تھے۔

بسم اللہ۔ تو کیا آپ کی لالں کے ہیں؟ انہوں نے انتقال کیا، پھر بھی آپ کا مال ہے۔

حسنو۔ میں نے یوں ہی تمہیں دکھا دیئے تھے، میرا مال نہیں ہے۔

بسم اللہ۔ جیسے میں پہچانتی نہیں۔ یہ وہی کڑے ہیں جو نواب نے اس دن میرے سامنے گروی رکھنے کو دیئے تھے۔

حسنو۔ لو اور سنو! یہ کب؟

بسم اللہ۔ یہ جب کہ جس دن بہن امراؤ کے مجرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ بہن امراؤ نے ضد کی کہ میں پورے سو لوں گی۔ نواب کے پاس خرچ نہ تھا میرے سامنے صندوقچہ نکال کے کڑے پھینک دیئے تھے۔ (پھر میری طرف مخاطب ہو کے) دیکھنا بہن امراؤ یہ وہی کڑے ہیں نا؟

میں۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو، کیا تم جھوٹ کہو گی۔

بسم اللہ۔ لے ٹھینگا کھایئے۔ اب یہ کڑے آپ کو نہ دیئے جائیں گے۔ یہ ہمارے نواب کے کڑے ہیں۔ ہم نے پہچانے۔ اب ہم نہ دیں گے۔

حسنو۔ لو اچھی کہی! اور وہ روپے جو ہم نے دیئے ہیں؟

بسم اللہ۔ روپے تم کہاں سے لائے؟ وہ بھی نواب کا مال تھا۔

حسنو۔ جی سچ! مہاجن سے بیاز و (سودی) نہ لا کے دیئے تھے؟

بسم اللہ۔ اچھا تو مہاجن کو بھیج دیجئے، ہم اس کو روپے دے دیں گے، آپ ٹہلئے۔

حسنو۔ کڑے تو میں لے کے جاؤں گا۔

بسم اللہ۔ میں تو نہ دوں گی۔

حسنو۔ تو کچھ زبردستی ہے؟

بسم اللہ۔ جی ہاں زبردستی ہے۔ لے اب چپکے سے کھسک جایئے، نہیں تو-----

حسنو۔ اچھا تو رہنے دیجئے، کل ہی دے دیجئے گا۔

بسم اللہ۔ کل دیکھا جائے گا۔

"دیکھا جائے گا" بسم اللہ نے اس تیور سے کہا کہ میاں حسنو کو چپکے سے اٹھ کے چلے جاتے ہی بن پڑی۔ بات یہ تھی کہ نواب صاحب کے چچا نے جب چھبن صاحب کے نوکروں سے حساب فہمی کی ہے اس وقت جس قدر اسباب جس جس کی معرفت دیا تھا اس کو سود اور اصل کے روپے دے کے چھڑا لیا۔ حسنو سے اس کڑے کی جوڑی کے لئے جب باز پرس کی گئی تو صاف مکر گیا کہ میری معرفت گروی نہیں ہوئے۔ اسی سے میاں حسنو کی کور دبتی تھی۔

بسم اللہ:- (حسنو کے چلے جانے کے بعد مجھ سے) دیکھا بہن، یہ بڑا قابوچی ہے۔ نواب کا گھر اسی موذی نے تہس نہس کیا ہے۔ میں مدت سے اس موئے کی تاک میں تھی۔ آج ہی تو داؤں پر چڑھا ہے۔ یہ کڑے میں اس کو کب دیتی ہوں۔ کر ہی کیا سکتا ہے۔ چوری کا تو مال ہے۔

میں:- ہرگز نہ دینا۔ دینا ہے تو نواب کو دے دو، احسان ہو گا۔

بسم اللہ:- نواب کو بھی نہ دوں گی۔ بہن گیارہ سو کی جوڑی ہے، موئے نے ساڑھے دو سو روپے پر ہتھیالی تھی، زیادہ بریں نیست۔ ساڑھے دو سو حوالے کروں گی۔ دس بیس سود کے سہی۔

میں:- بھلا مہاجن تمہیں کیوں دینے لگا؟

بسم اللہ:- کیسا مہاجن! اسی نے روپے دیئے تھے، اور جب بڑے نواب نے پوچھا تو کیسا مکر گیا۔ اگر یہ کچھ زیادہ ٹرپھس کریں گے تو ان کو کوتوالی کا چبوترہ دکھاؤں گی۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نواب صاحب تشریف لائے۔ پاپیادہ، اکیلے، چہرے پر اداسی چھائی ہوئی، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ نہ وہ شان و شوکت، نہ وہ رعب داب، نہ وہ بے تکلفی۔ چپکے آ کے اک کنارے بیٹھ رہے۔ سچ کہوں، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مگر میں نے اپنے کو روکا۔ مگر واہ ری بسم اللہ! رنڈی ہو تو ایسی ہو۔ آتے کے ساتھ ہی کڑوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

بسم اللہ:- نواب! دیکھو یہ وہی کڑے کی جوڑی ہے نا جو تم نے اس دن حسنو کو گروی کرنے کو دی تھی؟

نواب:- وہی ہیں۔ وہ تو مکر گیا تھا کہ میرے ہاتھوں گروی ہی نہیں ہوئے؟

بسم اللہ:- کتنے پر گروی ہوئے تھے؟

نواب:- یہ تو یاد نہیں، شاید ڈھائی سو یا ساڑھے دو سو، کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ:- اور سود کیا تھا؟

نواب:- سود کا حساب کس نے آج تک کیا۔ جو چیز گروی ہوئی، پھر اس کے چھڑانے کی نوبت نہیں آئی جو سود کا حساب کیا ہوتا۔

بسم اللہ:- اچھا تو یہ کڑے میں لے لوں؟

نواب:- لے لو۔

بسم اللہ:- کہو تو میاں حسنو کو مرزا صاحب کے پاس بھیجوں؟

نواب:- نہیں، میرے سر کی قسم! ایسا نہ کرنا سید ہے۔

بسم اللہ:- سید ہے؟ اس کے باپ کا پتا نہیں؟

نواب:- خیر وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔

میں اپنے دل میں نواب کی ہمت پر آفرین کرنے لگی۔ واہ ری ہمت، کیا کہنا، خاندانی رئیس ہیں نا!

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھئے، نواب سے وہی چھٹن جان کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ان کو سویرے سے رخصت کر دیا۔ خدا جانے کس سے وعدہ تھا۔ اس واقعے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے، میں خانم کے پاس بیٹھی ہوں۔ اتنے میں ایک بوڑھی سی عورت آئی، خانم صاحب کو جھک کے سلام کیا۔ خانم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے بیٹھ گئی۔

خانم:- کہاں سے آئی ہو؟

بڑھیا:- کیا بتاؤں کہاں سے آئی ہوں۔ کوئی ہے تو نہیں؟

خانم:- لو! یہاں کون ہے، میں ہوں اور تم ہو اور یہ چھوکری ہے۔ اس کو بات سمجھنے کی تمیز نہیں، کہو۔

بڑھیا:- مجھے نواب فخر النسا بیگم صاحب نے بھیجا ہے۔

خانم:- کون فخر النسا بیگم صاحب؟

بڑھیا:- اے لو تم نہیں جانتیں، نواب چھبن صاحب ------

خانم:- سمجھی، کہو۔

بڑھیا:- بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ بسم اللہ جان کی ماں ہیں نا؟

خانم:- ہاں، بات کہو۔

بڑھیا:- بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن صاحب میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں بھی اس پر پروانہ ہوں

اور اس کا باپ بھی پروانہ تھا۔ میرے نازوں کا پالا ہے اور اس کا چچا بھی دشمن نہیں ہے، اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ اس کے بھی ایک اکلوتی لڑکی ہے، بچپن کی منگیتر۔ لڑکی پر گالی چڑھ چکی ہے۔ چھبن نے شادی کرنے سے انکار کر دیا، اسی پر چچا کو برا معلوم ہوا۔ میں نے بھی دخل نہیں دیا۔ یہ سب تنبیہہ کے لئے کیا گیا ہے۔ تمہاری لڑکی کا عمر بھر کا گھر ہے۔ جو تنخواہ لڑکا دیتا تھا اس سے دس اوپر مجھ سے لینا مگر اتنا احسان مجھ پر کرد کہ شادی پر راضی کر دو۔ شادی کے بعد سب جائیداد اسی کی ہے۔ سوا اس کے اور ہے کون۔ میری اور چچا کی جان و مال کا مالک ہے۔ مگر اتنا خیال رکھو کہ یہ گھر تباہ نہ ہونے پائے۔ اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور ہمارا بھی۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔

خانم:۔ بیگم صاحب کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور عرض کرنا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، خدا چاہے تو وہی ہو گا۔ میں آپ کی عمر بھر کی لونڈی ہوں، مجھ سے کوئی امر خلاف نہ ہو گا، خاطر جمع رکھئے۔

بڑھیا:۔ مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن کو اس کی خبر نہ ہو۔ بڑا ضدی لڑکا ہے۔ اگر کہیں معلوم ہو گیا تو ہرگز نہ مانے گا۔

خانم:۔ (ماما سے) کیا مجال! (مجھ سے) دیکھو چھوکری کہیں کسی سے یہ قصہ نہ لے بیٹھنا۔

میں:۔ جی نہیں۔

اس کے بعد بڑھیا نے علیحدہ لے جا کے خانم سے چپکے چپکے باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سنیں۔ ماما کے رخصت کے وقت خانم کو اتنا کہتے سنا۔

خانم:۔ میری طرف سے عرض کرنا کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو قدیمی نمک خوار ہیں۔

بڑھیا کے جانے کے بعد خانم نے بسم اللہ کو بلا بھیجا اور کچھ ایسے دو انچھر کان میں پھونک دیئے کہ اب جو نواب صاحب آئے تو وہ آؤ بھگت ہوئی کہ ملازمت کے زمانے میں نہ ہوئی تھی۔

نواب صاحب بیٹھے ہیں، بسم اللہ سے اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں، میں بھی موجود ہوں۔ اتنے میں خانم صاحب خود بسم اللہ کے کمرے کے دروازے پر آ کے کھڑی ہوئیں۔

خانم:۔ اے لوگو ہم بھی آ دیں؟

بسم اللہ:۔ (نواب سے) ذرا سرک کر بیٹھو، اماں آتی ہیں۔
(خانم سے) آئیے۔

خانم نے سامنے آتے ہی نواب کو تین تسلیمیں کیں۔ میں نے آج کے دن کے سوا خانم کو اس طرح مؤدب ہو کر کسی کو سلام کرتے نہ دیکھا تھا۔

خانم:۔ (نواب سے) حضور کا مزاج کیسا ہے؟

نواب:۔ (گردن جھکا کے) الحمد للہ!

خانم:۔ خدا خوش رکھے! ہم لوگ تو دعا گو ہیں۔ ہزار بڑھ جائیں، مگر پھر بھی وہی ٹکے کی مال زادی، آپ کے ہاتھ کو دیکھنے والی۔ آپ کو خدا نے رئیس کیا ہے۔ اس وقت ایک عرض لے کے حاضر ہوئی ہوں۔ یوں تو بسم اللہ، خدا سلامت رکھے! سال بھر سے آپ کی خدمت میں ہیں، مگر میں نے کبھی آپ کو تکلیف نہیں دی، بلکہ حضور کے سلام کو بہت کم حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہو گا۔ اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جو چلی آئی۔

خانم تو یہ باتیں کر رہی ہیں، بسم اللہ جان ان کا منہ دیکھ رہی ہیں کہ یہ کہتی کیا ہیں۔ میں کسی قدر بات کا پہلو سمجھے ہوئے تھی۔ نواب کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ نواب کا یہ حال ہے کہ چہرے سے ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے۔ آنکھیں جھینپی جاتی ہیں، مگر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم:۔ تو پھر عرض کروں؟

نواب:۔ (بہت ہی مشکل سے) کہیئے۔

خانم:۔ (مجھ سے) ذرا بوا حسینی کو بلا لینا۔

میں گئی اور بوا حسینی کو بلا لائی۔

خانم:۔ (بوا حسینی سے) بوا ذرا دوشالے کی جوڑی تو اٹھا لانا، وہی جو کل بکنے کو آیا ہے۔

"بکنے کو آیا ہے" ان لفظوں نے نواب پر وہی اثر کیا جیسے کسی پر دفعتاً بجلی گر پڑے، مگر بہت ضبط کر کے چپکے سے بیٹھے رہے۔ اتنے میں بوا حسینی دوشالہ لے آئیں۔ کیسا پر تن زر کار دوشالہ کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

خانم:۔ (نواب کو دوشالہ دکھا کے) دیکھئے یہ دوشالہ کل بکنے کو آیا ہے۔ سوداگر دو ہزار کہتا ہے،

پندرہ سو تک لوگوں نے لگا دیا ہے، وہ نہیں دیتا۔ میری نگاہ میں سترہ بلکہ اٹھارہ تک مہنگا نہیں ہے۔ اگر حضور پرورش کریں تو بھلا اس بڑھاپے میں آپ کی بدولت ایک دوشالہ تو اوڑھ لوں۔

نواب خاموش بیٹھے رہے۔ بسم اللہ کچھ بولا ہی چاہتی تھیں کہ خانم نے جھڑک کے کہا۔

خانم۔ ٹھہر لڑکی، تو ہمارے بیچ میں نہ بولنا۔ تو تو آئے دن فرمائش کیا کرتی ہے، ایک فرمائش ہماری بھی سہی۔

نواب پھر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم۔ ادئی نواب صاحب! سخی سے سوم بھلا جو جلدی دے جواب۔ کچھ تو ارشاد کیجئے، سکوت سے تو بندی کو تسکین نہ ہو گی۔ ہاں نہ سہی، نہیں سہی، کچھ تو کہہ دیجئے۔ میرے دل کا ارمان تو نکل جائے۔

نواب اب بھی چپ ہیں۔

خانم۔ للہ! حضور جواب دیجئے۔ یوں تو میری حقیقت ہی کیا ہے! موئی بازاری کسبی! مگر آپ ہی لوگوں کی عزت دی ہوئی ہے۔ برائے خدا ان چھوکریوں کے سامنے تو مجھ بڑھیا کو ذلیل نہ کیجئے۔

نواب۔ (آب دیدہ ہو کر) خانم صاحب! اس دوشالے کی کوئی اصل نہیں ہے، مگر تم کو شاید میرا حال معلوم نہیں۔ کیا بسم اللہ جان نے کچھ نہیں کہا؟ اور ہاں امراؤ جان بھی تو اس دن وہیں تھیں۔

خانم۔ مجھ سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیوں خیر تو ہے؟

بسم اللہ پھر کچھ بولنے کو تھیں کہ خانم نے اشارہ کیا، وہ چپ رہیں، ٹال کے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ میں پہلے ہی سے بت بنی بیٹھی تھی۔

نواب۔ اب ہم اس قابل نہیں رہے جو آپ کی فرمائشوں کو پورا کریں۔

خانم۔ آپ کے دشمن اس قابل نہ رہے ہوں! اور میں ایسی چھچھوری نہیں جو روز فرمائش کیا کروں۔ فرمائش کریں یا نہ کریں، بسم اللہ کریں! بھلا میں بوڑھی آڑھی، میری فرمائش کیا اور میں کیا!

یہ کہہ کر خانم نے ایک آہ سرد بھری "ہائے تقدیر! اب ہم اس لائق ہو گئے کہ ایسے ایسے

رئیس ایک ذرا سے چیتھڑے کے لئے ہم سے منہ چھپاتے ہیں۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ خانم کا ایک ایک فقرہ نواب کے دل پر نشتر کا کام دے رہا تھا۔

نواب۔ خانم صاحب! آپ سب لائق ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں، اب میں اس لائق نہیں رہا جو کسی کی فرمائش پوری کروں۔

اس کے بعد نواب نے اپنی تباہی کا مختصر حال کہا۔

خانم۔ خیر میاں! اس لائق تو آپ نہیں رہے کہ ایک ادنیٰ سی فرمائش پوری کریں، پھر رنڈی کے مکان پر آنا کیا فرض تھا؟ حضور کو نہیں معلوم کہ بیسوائیں چار پیسے کی میت ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورو ---- ہم لوگ مروت کریں تو کھائیں کیا؟ یوں آیئے، آپ کا گھر ہے، میں منع نہیں کرتی، مگر آپ کو اپنی عزت کا خود ہی خیال چاہئے۔

یہ کہہ کے خانم فوراً کمرے سے چلی گئیں۔

نواب۔ واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اب انشاء اللہ نہ آؤں گا۔

یہ کہہ کے وہ اٹھنے کو تھے کہ بسم اللہ نے دامن پکڑ کے بٹھا لیا۔

بسم اللہ۔ اچھا تو اس کڑے کی جوڑی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

نواب۔ (کسی قدر ترش ہو کر) میں نہیں جانتا۔

بسم اللہ۔ اے واہ! تم تو بالکل خفا ہو گئے، جاتے کہاں ہو، ٹھہرو۔

نواب۔ نہیں بسم اللہ جان! اب مجھ کو جانے دو۔ اب میرا آنا بے کار ہے۔ جب خدا ہمارے دن پھیرے گا تو دیکھا جائے گا۔ اور اب کیا دن پھریں گے!

بسم اللہ۔ میں تو نہ جانے دوں گی۔

نواب۔ تو کیا اپنی ماں سے جوتیاں کھلواؤ گی؟

بسم اللہ۔ (مجھ سے) ہاں سچ تو ہے۔ بہن امراؤ! آج یہ بڑی بی کو ہوا کیا تھا۔ برسوں ہو گئے میرے کمرے میں آج تک جھانکی تک نہیں۔ آج آئیں بھی تو قیامت برپا کر گئیں۔ بھئی اماں جان چاہے خفا ہو جائیں چاہے خوش ہوں، میں نواب سے رسم ترک نہیں کر سکتی۔ آج نہیں ہے ان کے پاس نہ سہی، ایسی بھی کیا آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا۔ آخر یہی نواب ہیں جن کی بدولت ہزاروں روپے اماں جان نے پائے۔ آج اگر زمانہ ان سے پھر

گیا تو کیا ہم بھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں، گھر سے نکال دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ اب اگر اماں زیادہ تنگ کریں گی تو بہن امراؤ، میں سچ کہتی ہوں نواب کا ہاتھ پکڑ کے کسی طرف کو نکل جاؤں گی۔ لو میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

میں بسم اللہ کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی، ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔

بسم اللہ۔ اچھا نواب! تم کہاں رہتے ہو؟

نواب۔ کہاں بتاؤں؟

بسم اللہ۔ آخر کہیں تو؟

نواب۔ تحسین گنج میں مخدوم بخش کے مکان پر رہتا ہوں۔ افسوس میں نہ جانتا تھا کہ مخدوم ایسا نمک حلال آدمی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت شرمندہ ہوں۔

میں۔ یہ وہی مخدوم بخش ہے نا جو آپ کے والد کے وقت سے نوکر تھا جس کو آپ نے موقوف کر دیا تھا؟

نواب۔ ہاں وہی مخدوم بخش۔ کیا کہوں اس وقت وہ کیسا کام آیا۔ خیر اگر خدا نے چاہا.....

اتنا کہہ کے نواب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔ اس کے بعد نواب صاحب، بسم اللہ کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے کمرے کے باہر چلے گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ نواب سے چلتے وقت کچھ باتیں کروں گی، اور اسی لئے ان کے ساتھ ہی اٹھی تھی، مگر وہ اس قدر جلد زینے سے اتر گئے کہ میں کچھ نہ کہہ سکی۔ نواب کے تیور اس وقت بہت برے تھے۔ خانم کی باتوں نے نواب کے دل پر سخت اثر کیا تھا۔ ان کی حالت بالکل مایوسی کی تھی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب باتیں جو خانم نے آج کی ہیں، وہ سب اس فہمائش کی تمہید ہیں جو اور کسی وقت پر موقوف رکھی گئی ہے، مگر مجھے بہت ہی تشویش تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کچھ کھا کے سو رہیں تو اور غضب ہو۔

سر شام میں اور بسم اللہ دونوں سوار ہو کے تحسین گنج گئے۔ مخدوم بخش کا مکان بڑی مشکل سے ملا۔ کہاروں نے اس کے دروازے پر آواز دی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اندر سے نکلی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخدوم بخش گھر پر نہیں ہے۔ نواب کو پوچھا اس نے کہا وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں، ابھی تک نہیں آئے۔ دو گھنٹے تک انتظار کیا نہ نواب صاحب آئے نہ مخدوم بخش، آخر مایوس ہو کر گھر چلے آئے۔

دوسرے دن صبح کو مخدوم بخش نواب کو ڈھونڈتا ہوا آیا۔ معلوم ہوا کہ رات کو بھی اس کے

مکان پر نہیں گئے۔ شام کو ان کی والدہ کی ماما وہی بڑھیا جو ایک دن خانم کے پاس آئی تھی، روتی پیٹتی آئی۔ اس سے بھی یہی خبر ملی کہ نواب کا کہیں پتا نہیں ہے۔ بیگم صاحب نے روتے روتے اپنا عجب حال کیا، بڑے نواب سخت متفکر ہیں۔ اس واقعے کو کئی دن گزر گئے اور نواب چھبن صاحب کا کہیں پتا نہ ملا۔

اس واقعے کے چوتھے پانچویں روز چھبن صاحب کے ہاتھ کی انگوٹھی نخاس میں بکتی ہوئی پکڑی گئی، بیچنے والے کو علی رضا بیگ کوتوال کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا مجھے امام بخش ساقی کے لڑکے نے بیچنے کو دی ہے۔ امام بخش ساقی کا لڑکا تو نہ ملا، خود امام بخش پکڑ بلایا گیا۔ پہلے امام بخش صاف مکر گیا کہ میں اس انگوٹھی کو نہیں جانتا۔ آخر مرزا نے خوب ڈانٹا اور دھمکایا تو قبول دیا۔

امام بخش۔ حضور! میں لب دریا لوہے کے پل کے پاس حقہ پلاتا ہوں۔ جو لوگ دریا نہانے جاتے ہیں، ان کے کپڑوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ پانچ دن کا ذکر ہے، ایک شریف زادے، کوئی بیس بائیس برس کی عمر ہو گی، گورے گورے سے تھے، بہت خوبصورت نوجوان تھے، سر شام پکے پل پر نہانے آئے۔ کپڑے اتار کے میرے پاس رکھوا دیئے، مجھ سے لنگی لے کے باندھی، خود دریا میں کود پڑے۔ تھوڑی دیر تک نہایا کئے۔ پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور سب لوگ دریا سے نہا نہا کے نکلے، کپڑے پہن پہن کے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، وہ صاحب نہ آئے۔ میں یہ سمجھا کہ کسی طرف تیرتے ہوئے نکل گئے ہوں گے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں اس آسرے میں کہ اب آتے ہیں، اب آتے ہیں، پہر رات گئے تک بیٹھا رہا۔ آخر کو مجھے یقین ہو گیا کہ ڈوب گئے۔ اب میں نے دل میں یہ سوچا کہ اگر کسی کو خبر کرتا ہوں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں گا۔ کھنچا کھنچا پھروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ چپ ہو رہوں۔ ان کے کپڑے اٹھا کے گھر پر لے آیا۔ جیب میں سے یہ انگوٹھی نکلی اور ایک اور انگوٹھی ہے۔ اس میں خدا جانے کیا لکھا ہے۔ میں نے مارے ڈر کے آج تک کسی کو نہیں دکھائی۔ میں تو اس انگوٹھی کو بھی نہ بیچتا، مگر میرا لڑکا شہدا ہو گیا ہے، وہ چرا کے لے آیا۔

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کوتوالی سے ساتھ کئے، وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب کو اس سانحے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوا دیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔

بسم اللہ۔ ہا! آخر نواب چھبن صاحب ڈوب گئے نا؟ میں تو سچ کہوں اماں جان کی گردن پر ان کا خون ہوا۔

میں۔ افسوس! میں تو اسی دن دل میں کھٹک گئی تھی، اسی لئے اس دن ان کے ساتھ اٹھی تھی کہ کچھ سمجھادوں گی، مگر وہ زینے سے اتر ہی گئے۔

بسم اللہ۔ ان کے سر پر قضا سوار تھی۔ خدا غارت کرے بڑے نواب کو! نہ ان کو جائیداد سے بے حق کرتے نہ وہ اپنی جان دیتے۔

میں۔ خدا جانے اماں کا کیا حال ہوا ہوگا۔

بسم اللہ۔ سنا ہے بے چاری دیوانی ہو گئی ہیں۔

میں۔ جو نہ ہو کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آمیں کا لڑکا تھا۔ ایک تو بے چاری رانڈ بیوہ، دوسرے یہ آفت ان کے سر پر ٹوٹ پڑی، سچ پوچھو تو ان کا گھر ہی تباہ ہو گیا۔

رسوا۔ تو نواب چھبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اچھا اس موقع پر ایک بات اور مجھے پوچھ لینے دیجئے۔

میں۔ پوچھئے۔

رسوا۔ نواب صاحب تیرنا جانتے تھے یا نہیں؟

میں۔ کیا معلوم، یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا۔ اس لئے کہ مجھے میر مچھلی صاحب نے ایک نکتہ بتایا تھا کہ جو شخص تیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔

(7)

کچھ ان کو امتحان وفا سے غرض نہ تھی
اک زار و ناتواں کے ستانے سے کام تھا

امراؤ۔ مرزا رسوا صاحب! آپ کو کسی سے کبھی عشق بھی ہوا ہے؟

رسوا۔ جی نہیں، خدا نہ کرے! آپ کو تو سینکڑوں سے عشق ہوا ہوگا آپ اپنا حال کہئے۔ ایسی ہی باتیں سننے کے تو ہم مشتاق ہیں، مگر آپ کہتی نہیں۔

امراؤ۔ یوں تو میرا رنڈی کا پیشہ ہے اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے۔ جب کسی کو دام میں لایا چاہتے ہیں اس پر مرنے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنی، بات بات پر رو دینا، دو دو دن کھانا نہ کھانا، کنوئیں میں پیر لٹکا کے بیٹھ جانا، سنکھیا کھا لینا، یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کیسا ہی سخت دل کا آدمی کیوں نہ ہو، ہمارے فریب میں آ ہی جاتا ہے۔ مگر آپ سے سچ کہتی ہوں کہ نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا اور نہ مجھ کو کسی سے۔ البتہ بسم اللہ جان کو عشق بازی کا بڑا ملکہ تھا۔ انسان تو انسان فرشتہ ان کے جال سے نہیں نکل سکتا تھا۔ ہزاروں ان کے عاشق تھے، اور وہ ہزاروں پر عاشق تھیں، سچے عاشقوں میں ایک مولوی صاحب قبلہ کا چہرہ بھی تھا۔ ایسے ویسے مولوی نہ تھے، عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ معقولات میں ان کا مثل و نظیر نہ تھا۔ جس زمانے کا میں ذکر کرتی ہوں، سن شریف ستر سے کچھ کم ہی ہوگا۔ نورانی چہرہ، سفید داڑھی، سر منڈا ہوا، اس پر عمامہ، عبائے شریف، عصائے مبارک۔ ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں اور اس طرح عاشق ہیں۔ ایک دن کا واقعہ عرض کرتی ہوں، اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہ سمجھئے، بالکل صحیح صحیح ہے۔ آپ کے دوست ----- میر صاحب قبلہ مرحوم، جن کو دلبر جان سے تعلق تھا خود شاعر تھے اور عمدہ اشعار پر دم دیتے تھے۔ اسی سلسلے میں حسن پرستی کا بھی شوق تھا مگر نہایت ہی معقولیت کے ساتھ۔ شہر کی وضع دار رنڈیوں میں کون ایسی تھی جہاں وہ نہ جاتے ہوں۔

رسوا۔ جی ہاں، کہئے، میں خوب جانتا ہوں۔ خدا ان کے درجات عالی کرے۔

امراؤ۔ وہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو، بسم اللہ جان خانم سے لڑ کے کچھ دنوں کے لئے اس مکان میں جا رہی تھیں جو بڑا زے کے پچھواڑے تھا۔

رسوا۔ میں اس مکان پر کبھی نہیں گیا۔

امراؤ۔ خیر، مگر بسم اللہ کے دیکھنے کے لئے اور اس غرض سے بھی کہ ماں بیٹیوں میں ملاپ لگا

دوں، میں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن قریب شام صحن میں تختوں کے چوکے پر گاؤ تکئے سے لگی بیٹھی ہیں۔ میر صاحب مرحوم ان کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ سامنے دور مہذب بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی بے بسی کی صورت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ زیتون کی تسبیح پر چپکے چپکے (شاید) یا حفیظ یا حفیظ پڑھ رہے ہیں۔ میں جو گئی تو بسم اللہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے برابر بٹھا لیا۔ میں میر صاحب اور مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے چپکے سے میرے کان میں کہا "تماشا دیکھو گی؟"

میں۔ (حیران ہو کر) کیسا تماشا؟

بسم اللہ۔ دیکھو!

یہ کہہ کر مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔ مکان کے صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا اس درخت پر چڑھ جاؤ مولوی صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ تھر تھر کانپنے لگے۔ میں زمین میں گڑی جاتی تھی۔ میر صاحب منہ پھیر کے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بے چارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے، کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ وہاں ایک حکم کر کے دوسرا حکم پہنچا، اور فوراً تیسرا نادری حکم "چڑھ جاؤ، کہتی ہوں۔"

اب میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اٹھے، عبائے شریف کو تختوں کے چوکے پر چھوڑا، نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوئے۔ پھر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک ذرا چیں بہ جبیں ہو کے کہا "ہوں"!

مولوی صاحب پائنچے چڑھا کے درحت پر چڑھنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس دیکھنے کا شاید یہ مطلب تھا کہ بس یا اور۔

بسم اللہ۔ اور۔

مولوی صاحب اوپر چڑھے، پھر حکم کا انتظار کیا۔ پھر وہی "اور"۔ اسی طرح درخت کی پھننگ کے پاس پہنچ گئے۔ اب اگر اور اوپر جاتے تو شاخیں اس قدر پتلی تھیں کہ ضرور ہی گر پڑتے اور جان بحق تسلیم ہو جاتے۔ بسم اللہ کی زبان سے "اور" نکلنے ہی کو تھا کہ میں قدموں پر گر پڑی، میر صاحب نے نہایت منت کے ساتھ سفارش کی۔ بارے حکم ہوا "اتر آؤ"۔ مولوی صاحب چڑھنے کو چڑھ گئے تھے مگر اترنے میں بڑی دقت ہوئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور اب گرے، مگر بخیر و

عافیت اتر آئے۔ بے چارے پسینہ پسینہ ہو گئے، دم پھول گیا۔ قریب تھا کہ گر پڑیں مگر اپنے کو سنبھال کے، نعلین پہن کے، تخت کے قریب آئے، عبائے مبارک زیب دوش کیا، چپکے بیٹھ گئے، تسبیح پڑھنے لگے۔ بیٹھ تو گئے مگر کسی پہلو قرار نہ تھا۔ چیونٹے ازار شریف میں گھس گئے تھے، اس سے بہت پریشان تھے۔

رسوا۔ بھئی واللہ! بسم اللہ بھی عجب دل لگی باز رنڈی تھی۔

امراؤ۔ دل لگی کا ذکر کیا، وہ بیدرد چپکی بیٹھی تھی، تبسم کا اثر بھی چہرے پر نہ تھا۔ میں اور میر صاحب دونوں دم بخود بیٹھے تھے۔ ایک عجیب عالم عبرت طاری تھا۔

رہے گا کیوں کوئی طرز ستم باقی زمانے میں
مزا آتا ہے اس کافر کو الفت آزمانے میں

رسوا۔ یہ جملہ عمر بھر ہنسنے کے لئے کافی ہے، تصور شرط ہے۔ تم نے تو بیان کیا اور میری آنکھوں کے سامنے بسم اللہ، مولوی صاحب اور ان کی مقدس صورت، میر صاحب، تم، صحن، نیم کا درخت، ان سب کی تصویر کھنچ گئی۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتاً ہنسی بھی نہیں آتی۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے۔ بیشک بسم اللہ قیامت کی رنڈی تھی۔ ستر برس کا بڈھا اور اس پر یہ حکم "درخت پر چڑھ جاؤ" اور وہ بھی چڑھ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔

امراؤ۔ واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں قیامت کی باریکی ہے۔ آخر بیان ہی کرنا پڑا۔

رسوا۔ للہ بیان کیجئے۔ کیا ابھی کچھ اور فضیحت باقی ہے؟

امراؤ۔ ابھی بہت سی فضیحتیں باقی ہیں۔ لے سنیئے۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد میں نے بسم اللہ جان سے پوچھا تھا۔

میں:۔ بسم اللہ! یہ تجھ کو کیا ہوا تھا؟

بسم اللہ:۔ کیا؟

میں:۔ ستر برس کا بڈھا، اور جو درخت پر سے گر پڑتا تو مفت خون ہوتا!

بسم اللہ:۔ ہماری بلا سے خون ہوتا۔ میں تو اس موئے بوبک سے جلی ہوئی تھی۔ کل میری دھنو کو اس زور سے پٹخا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی ہوتی۔

بات یہ تھی کہ بسم اللہ جان نے ایک بندریا پالی تھی۔ اس کا بڑا گہرا سہاگ تھا۔ ذرا اس کے

ٹھاٹھ سن لیجیۓ۔ اطلس کی گھنگریا، کامدانی کی کرتی، جالی کی اوڑھنی، چاندی کی چوڑیاں، طوق گھونگھرو، سونے کی بالیاں جلیبیاں امرتیاں کھانے کو۔ جب مول لی تھی تو موئی ذرا سی تھی، دو تین برس میں کھا کھا کے خوب موٹی ہوئی تھی۔ جو لوگ جانتے تھے وہ تو خیر، اجنبی آدمی پر دفعتاً جا پڑے تو گھگھی بندھ جائے۔ زور بھی اتنا تھا کہ اچھے مرد کا ہاتھ پکڑ لے تو چھڑائے نہ چھوٹے۔

جس دن مولوی صاحب نیم پر چڑھائے گئے ہیں، اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ آپ تشریف لائے۔ تختوں کے چوکے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بسم اللہ جان کو مسخرہ پن سوجھا، دھنو کو اشارہ کیا۔ وہ پشت سے چپکے چپکے آئی اور اچک کے مولوی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھی۔ مولوی صاحب نے جو مڑ کے دیکھا بے چارے گھبرا گئے، زور سے جھٹک دیا۔ یہ تخت کے نیچے گر پڑی۔ یا میں تو جانتی ہوں خود چلی گئی ہو گی۔ مولوی صاحب پر کھو کھیانے لگی۔ مولوی صاحب نے لاٹھی دکھائی، وہ ڈر کے مارے بسم اللہ کی گود میں جا بیٹھی۔ بسم اللہ نے اسے تو چمکار دوپٹے کا آنچل اوڑھا دیا اور مولوی صاحب کو خوب دل کھول کے کوسا، گالیاں دیں۔ اس پر بھی صبر نہ آیا، دوسرے دن یہ سزا تجویز کی۔

رسوا:۔ سزا مناسب تھی۔

امراؤ:۔ مناسبت میں تو کوئی شک نہیں، مولوی صاحب کو کھٹکے کا لنگور بنا دیا۔

رسوا:۔ واقعی مولوی صاحب لائق تعزیر تو تھے۔ قیس نے تو سگ لیلیٰ کو پیار کر کے گود میں اٹھا لیا تھا اور مولوی صاحب نے بسم اللہ جان کی چہیتی بندریا کو اول تو جھٹک دیا، پھر یہ بے ادبی کہ اسے لاٹھی دکھائی، عشق کی شان سے بہت بعید تھا۔

ایک دن، رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں ہوں۔ بسم اللہ گا رہی ہیں، میں طنبورہ چھیڑ رہی ہوں، خلیفہ جی طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں مولوی صاحب قبلہ تشریف لائے۔

بسم اللہ:۔ (دیکھتے ہی) یہ آٹھ دن سے آپ کہاں تھے؟

مولوی صاحب:۔ کیا کہوں، مجھے تو اب کی ایسی تپ شدید لاحق ہوئی تھی کہ بچنا محال تھا، مگر تمہارا دیدار دیکھنا تھا، اس لئے جانبر ہو گیا۔

بسم اللہ:۔ تو یہ کہئے وصال ہو گیا تھا۔

اس فقرے نے مجھ کو اور خلیفہ جی کو پھڑکا دیا۔

مولوی صاحب:۔ جی ہاں، آثار تو کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ:۔ واللہ اچھا ہوتا!

مولوی صاحب:۔ میرے مرنے سے آپ کا کیا نفع ہوتا ہے؟

بسم اللہ:۔ جی آپ کے عرس میں ہر سال جایا کرتے۔ گاتے، ناچتے، لوگوں کو رجاتے، آپ کا نام روشن کرتے۔

اسی طرح چند باتوں کے بعد پھر گانا شروع ہوا۔ بسم اللہ نے حسب موقع یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی

مولوی صاحب پر وجد کی حالت طاری تھی۔ آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ قطرے ریش مقدس سے ٹپک رہے تھے۔

اتنے میں سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک صاحب جوان، گندمی رنگ، گول چہرہ، سیاہ داڑھی، میانہ قد، کسرتی بدن، جامدانی کا انگرکھا پھنسا پھنسا پہنے ہوئے، کھلے پائنچوں کا پاجامہ، مخملی جوتا نہایت عمدہ، جالی پر کی چکن کا رومال اوڑھے ہوئے داخل ہوئے۔ بسم اللہ نے دیکھتے ہی کہا، وہ صاحب! اس دن کے گئے آج آپ آئے۔ لے بس اب نہلیئے۔ میں ایسی آشنائی نہیں رکھتی۔ اور وہ لال طاقی گرنٹ کے طاقے کہاں ہیں؟ اسی سے تو آپ نے منہ چھپایا۔

وہ صاحب:۔ (لجاجت کے لہجے میں) نہیں سرکار! یہ بات نہیں، اس دن سے مجھے فرصت نہیں ملی۔ والدہ کی طبیعت علیل تھی، میں ان کی تیمار داری میں تھا۔

بسم اللہ:۔ جی ہاں، آپ ایسے ہی سعادت مند ہیں، مجھے یقین ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ آج کل بن کی چھوکری پر آپ فریفتہ ہیں اور رات کو وہیں کی دربار داری ہوتی ہے۔ مجھے سب خبریں ملی ہیں، اور ہم سے فقرے ہوتے ہیں کہ والدہ کی طبیعت علیل تھی۔

اس آواز کو سن کے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ان کی اور ان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مولوی صاحب نے فوراً منہ پھیر لیا۔ دوسرے صاحب کو جو دیکھتی ہوں تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے۔ جلدی سے دروازہ کھول، کمرے کے نیچے تھے۔ بسم اللہ پکارتی کی پکارتی رہی، انہوں نے جواب نہ دیا۔

بسم اللہ بھی کچھ سمجھ کے پہلے تو چپ سی ہو گئی، مگر پھر ایک مرتبہ تیوری چڑھا کر آپ ہی آپ کہنے لگی "پھر باشد!" اتنا کہہ کے گانے میں مصروف ہو گئی۔ اس دن کے بعد میں نے ان کو

کبھی بسم اللہ کے پاس آتے نہیں دیکھا، مولوی صاحب برابر آیا کئے۔

رسوا۔ جی ہاں! اگلے زمانے کے لوگ ایسے ہی وضع دار ہوتے تھے۔

گانا ہو رہا تھا کہ گوہر مرزا شاید یہ سن کے کہ میں بھی یہاں ہوں، یہیں چلے آئے۔ ان سے بسم اللہ سے ہنسی ہوتی تھی۔ گالی گلوچ سے لے کر کشتم کشتا تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ میرا مزاج ایسا چھچھورا نہ تھا کہ برا مانتی۔

گوہر مرزا آتے ہی میرے اور بسم اللہ کے بیچ میں بیٹھ گیا اور جھپ سے بسم اللہ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

گوہر مرزا۔ آج تو خوب گا رہی ہو۔ جی چاہتا ہے ------

اب جو دیکھتی ہوں تو مولوی صاحب کے ماتھے کی جھریوں میں حرکت ہونے لگی۔ ایک ہی مرتبہ گوہر مرزا کی نگاہ مولوی صاحب پر جا پڑی۔ پہلے تو بغور صورت دیکھی، پھر اپنا کان زور سے پکڑ جھجک کے پیچھے ہٹا۔ (یہ معلوم ہوتا تھا گویا آپ ڈر گئے) بسم اللہ اس حرکت پر بے تحاشا ہنس پڑی، خلیفہ جی مسکرانے لگے، میں نے منہ پر رومال رکھ لیا، مگر مولوی صاحب بہت ہی چیں بہ جبیں ہوئے۔ بلکہ قریب تھا کہ اٹھ جائیں کہ بسم اللہ نے کہا "بیٹھو"۔ بے چارے پھر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ بھی کیا ہی شریر تھی۔ مولوی صاحب پر یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ گوہر مرزا میرے آشنا ہیں، تاکہ مولوی صاحب دیکھ کے جلیں۔ گوہر مرزا نے ہنسنا شروع کیا۔ بڑی دیر تک مولوی صاحب کو اس دھوکے میں رکھا، اور ان کا وہ حال جیسے کوئی انگاروں پر لوٹ رہا ہو، جھلسے جاتے ہیں۔ مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ آخر مولوی صاحب کی بے بسی پر مجھی کو رحم آیا، میں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس پر بسم اللہ مجھ سے ناراض بھی ہو گئیں۔ میں نے گوہر مرزا کی طرف متوجہ ہو کے کہا "لے اب چھلا پن کر چکے، چلو۔"

اب مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا کہ گوہر مرزا کا مجھ سے رسم ہے، بسم اللہ کا کوئی واسطہ نہیں۔ بہت ہی خوش ہوئے، باچھیں کھل گئیں۔

رسوا۔ مولوی صاحب کو تو پاک محبت تھی نا؟

امراؤ۔ پاک محبت تھی۔

رسوا۔ پھر ان کو جلنا نہ چاہیئے تھا۔

امراؤ۔ واہ! کیا پاک محبت میں رشک نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔

رسوا۔ تو پاک محبت نہ ہوگی۔

امراؤ۔ اب یہ ان کا ایمان جانے، میں تو یہی سمجھتی تھی۔

خانم کی نوچیوں میں یوں تو میرے سوا ہر ایک اچھی تھی، مگر خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی سورت تھی، رنگ میدا شہاب، ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کے بھر دیئے ہیں۔ ہاتھ پاؤں سڈول، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بھرے بھرے بازو، گول کلائیاں، جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لئے مناسب تھا۔ اداؤں میں وہ دل فریبی، وہ بھولا پن کہ جو ایک نظر دیکھے، ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے۔ جس محفل میں جا کے بیٹھ گئی، معلوم ہوا کہ ایک شمع روشن ہو گئی۔ بیسیوں رنڈیاں بیٹھی ہوں، نظر اسی پر پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ تھا، مگر تقدیر کی اچھی نہ تھی۔ اور تقدیر کو بھی کیوں الزام دیجئے، خود اپنے ہاتھ عمر بھر خراب رہی، حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی بننے کے لائق نہ تھی۔ بیسواڑے کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ صورت سے شرافت ظاہر تھی۔ حسن خداداد تھا، مگر اس حسن و جمال پر خبط یہ تھا کہ کوئی مجھ پر عاشق ہو۔ یوں تو وہ خود ہی پیار کرنے کے لائق تھی۔ کون ایسا ہو گا جو اس پر فریفتہ نہ ہو جاتا ہو۔ اول ہی اول پیارے صاحب کو محبت تھی۔ ہزار ہا روپے کا سلوک کیا۔ واقعی جان دیتے تھے۔ خورشید نے بھی انہیں اچھی طرح کسا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سچا عاشق ہے، خود جان دینے لگیں۔ دن دن بھر کھانا نہیں کھاتیں۔ اگر ان کو کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی، بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔ ہم سب نے صلاح دی "دیکھو خورشید! ایسا نہ کرو۔ مردوے بے مروت ہوتے ہیں۔ تمہارے ان کے صرف آشنائی ہے، آشنائی کی بنیاد کیا۔ نکاح نہیں ہوا، بیاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا چاہو گی تو اپنا برا چاہو گی، پچھتاؤ گی۔ آخر ہمارا ہی کہا ہوا۔ پیارے صاحب نے جب دیکھا کہ رنڈی پیار کرتی ہے، لگے غمزے کرنے۔ یا تو آٹھوں پہر بیٹھے رہتے تھے یا اب ہیں کہ دو دو پہروں نہیں آتے۔ خورشید جان دیئے دیتی ہے۔ روتی ہے، پیٹتی ہے، کھانا نہیں کھاتی، عجیب حال ہے، خانم کو صورت سے نفرت ہو گئی، یہاں تک کہ آنا جانا، کھانا پینا، آدمیوں کی تنخواہ سب موقوف۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس حسن کے ساتھ عشق اس کے دل میں کس نے بھر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جورو ہوتی تو میاں بیوی میں خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر مرد پاؤں دھو دھو کے پیتا، بشرطیکہ قدر دان ہوتا۔ بسم اللہ، خورشید کے تلوؤں کی برابری نہیں کر سکتی تھی۔ اس پر وہ تمکنت، وہ غرور، وہ غمزہ، وہ تکتورا کہ خدا کی پناہ۔ مولوی صاحب کا حال تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ اور آشناؤں

سے بھی اس کا سلوک کچھ اچھا نہ تھا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کو اپنی ماں کی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ واقعی دولت بھی لازوال تھی۔ اپنے آگے کسی کی ہستی ہی نہ سمجھتی تھی۔ خورشید کی ذات سے خانم کو بڑی امیدیں تھیں۔ واقعی اگر اس میں رنڈی پن ہوتا تو لاکھوں ہی پیدا کرتی۔ اس حسن و خوبی پر آواز بالکل ہی نہ تھی۔ ناچنے میں بھی بالکل پھوہڑ تھیں۔ صرف صورت ہی صورت تھی۔ اول اول مجرے بہت آتے تھے، آخر جب معلوم ہوا کہ گانے ناچنے میں تمیز نہیں، لوگوں نے بلانا چھوڑ دیا۔ جو تھا وہ صورت کا عشاق ہو کے آتا تھا۔ اچھے اچھے مرتے تھے، مگر جب آ کے دیکھا منہ تھو تھائے بیٹھی ہیں۔ ان پر عشق سوار تھا، ہر ایک سے بے رخی، بے اعتنائی۔ یہ حالت دیکھ کے لوگوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ اب پیارے صاحب ہی صرف رہ گئے۔ ادھر تماشا دیکھئے کہ پیارے صاحب کے والد پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ گھر کی ضبطی ہو گئی، جاگیر چھین لی گئی، بے چارے محتاج ہو گئے۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر خورشید کے عشق میں کمی نہ ہوئی۔ اب یہ ضد ہوئی کہ مجھے گھر میں بٹھا لو۔ پیارے صاحب نے بہ پاس خاندان یا یوں کہو کہ باپ کے ڈر سے منظور نہ کیا، خورشید کی آس ٹوٹ گئی۔

خورشید بہت ہی بھگی عورت تھی۔ سینکڑوں روپے پھسلا پھسلا کے لوگ کھا گئے۔ فقیر فقرا سے آپ کو بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ایک شاہ صاحب تشریف لائے۔ وہ ایک کے دو کرتے تھے۔ خورشید نے اپنے کڑے اور کنگن کی جوڑیاں اتار دیں۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی، اس میں سیاہ تل بھروا دیئے، کڑے کنگن ہانڈی میں رکھ کر چپنی ڈھانک دی۔ شال باف کا ایک پارچہ گلے میں باندھ ناڑے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کہہ گئے آج نہ کھولنا کل صبح کو کھولنا مرشد کے حکم سے ایک کے دو ہو جائیں گے۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی، کالے تلوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

ایک جوگی نے کالے ناگ کا پھن منہ سے نکال کے دکھایا کہ یہ تجھے پرسوں آ کے ڈس جائے گا۔ خورشید نے کانوں سے سچے بالیاں اتار کے حوالے کیں۔ خورشید کو کبھی غصہ آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج عورتیں تو بہو بیٹیوں میں بھی کم ہوتی ہیں، رنڈیوں کا ذکر کیا۔ مگر ہاں ایک دن غصہ آیا، جس دن پیارے صاحب مانجھے کا جوڑا پہن کے آئے۔ اول تو چپکی بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد گالوں پر سرخی نمودار ہوئی، رفتہ رفتہ سرخ بھبھوکا ہو گئے۔ اس کے بعد اٹھی، مانجھے کے جوڑے کو پرزے پرزے کر ڈالا۔ اب رقت شروع ہوئی۔ دو دن تک رویا کی۔ تمام دنیا نے سمجھایا، کچھ نہ مانا۔ آخر بخار آنے لگا۔ دو مہینے بیمار رہی۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ حکیموں نے دق تجویز کیا، لیکن

خدا کے فضل سے دو مہینے کے بعد مزاج خود بہ خود روبہ اصلاح ہو گیا۔ اب پیارے صاحب سے بظاہر چشم چشا ہو گئی۔ اس کے بعد اور لوگوں سے ملاقات ہوئی، مگر کسی سے دل نہ لگا، اور نہ کسی کا دل ان سے، اس لئے کہ بے توجہی اور بے اعتنائی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ بظاہر ملتی تھیں مگر دل نہ ملتا تھا۔

ساون کا مہینہ ہے، سہ پہر کا وقت ہے، پانی برس کے کھل گیا ہے۔ چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے۔ ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ پچھم کی طرف رنگ رنگ کی شفق پھولی ہوئی ہے۔ چوک میں سفید پوشوں کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ آج زیادہ تر مجمع کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جمعے کا دن ہے، لوگ عیش باغ کے میلے کو جلد جلد قدم اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ خورشید، امیر جان، بسم اللہ اور میں میلے جانے کے لئے بن ٹھن رہی ہیں۔ دھانی دوپٹے جو ابھی رنگ ریز رنگ کے دے گیا ہے، چنے جاتے ہیں، بالوں میں کنگھیاں ہو رہی ہیں، چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں، بھاری زیور نکالے جاتے ہیں۔ خانم صاحب سامنے چوکے پر گاؤ تکئے سے لگی بیٹھی ہیں۔ بوا حسینی ابھی حیچوان لگا کے پیچھے ہٹی ہیں۔ خانم صاحب کے سامنے میر صاحب بیٹھے ہیں۔ میلے جانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں "آج میری طبیعت سست ہے، میں نہیں جانے کی۔" ہم لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں خدا کرے نہ جائیں تو میلے کی بہار ہے۔

خورشید پر اس دن غضب کا جوبن ہے۔ گوری رنگت ململ کے دھانی دوپٹے سے پھوٹی نکلتی ہے۔ اودی گرنٹ کا پاجامہ بڑے بڑے پائنچوں کا سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ چھنی چھنسی کرتی قیامت ڈھا رہی ہے۔ ہاتھ گلے میں ہلکا ہلکا زیور ہے۔ ناک میں ہیرے کی کیل، کانوں میں سونے کی انتیاں، ہاتھوں میں کڑے، گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ سامنے کمرے میں قد آدم آئینہ لگا ہے، اپنی صورت دیکھ رہی ہیں۔ کیا کہوں کیا صورت تھی! اگر میری صورت، ویسی ہوتی تو اپنے عکس کی آپ ہی بلائیں لے لیتی۔ مگر ان کو یہ غم ہے کہ ہائے اس صورت کا کوئی دیکھنے والا نہیں۔ پیارے صاحب سے بگاڑ ہی ہو چکا ہے۔ چہرہ اداس اداس ہے۔ ہائے وہ اداسی بھی غضب کر رہی ہے۔ اچھی صورت والوں کا سب کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت اس پری پیکر کی صورت دیکھنے سے دل پسا جاتا ہے۔ اور تو کوئی مثال اپنے دل کی حالت کی سمجھ میں نہیں آتی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے شاعر کا کوئی شعر درد آمیز سنا ہے اور دل اس کے مزے لے رہا ہے۔

بسم اللہ کی صورت ایسی بری نہ تھی۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ، کتابی چہرہ، ستواں ناک، بڑی بڑی

آنکھیں، سیاہ پتلی، چھریرا بدن، بوٹا سا قد، کارچوبی تولواں جوڑا، کاہی کریب کا دوپٹا بنت ٹکی ہوئی، زرد گرنٹ کا پاجامہ، بیش قیمت زیور سر سے پاؤں تک، گہنے میں لدی ہوئی، اس پر طرہ پھولوں کا گہنا۔ این مین چوتھی کی دلہن معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس پر بات بات میں شوخی و شرارت۔ میلے میں پہنچ کر کسی کا منہ چڑھا دیا، کسی سے آنکھ لڑائی۔ جب وہ دیکھنے لگا تو منہ پھیر لیا۔ ہاں یہ کہنا بھول گئی کہ ہم لوگ بناؤ سنگھار کر کے میانوں میں سوار ہوئے، میلے پہنچے۔

میلے میں وہ بھیڑیں تھیں کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں۔ خوانچے والے، میوہ فروش، ہار والے، تنبولی، ساقنیں، غرض کہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے، سب کچھ تھا۔ مجھے اور تو کسی چیز سے کچھ کام نہیں، لوگوں کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے، خصوصاً میلے تماشوں میں۔ خوش، ناخوش، مفلس، تونگر، بے وقوف، عقل مند، عالم، جاہل، شریف، رذیل، سخی، بخیل، یہ سب حال چہرے سے کھل جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تن زیب کے انگرکھے اور اودی صدری، نکہ دار ٹوپی، چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اتراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں صندلی رنگا ہوا دوپٹا سر سے آڑا باندھے ہوئے، رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے، مگر بہت ہی مکدر، چیں بہ جبیں، کچھ چپکے چپکے بڑبڑاتے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بیوی سے لڑ کے آئے ہیں۔ جن باتوں کے جواب بروقت نہ سوجھے تھے انہیں اب یاد کر رہے ہیں۔ کوئی صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ "اماں کھانا پکاتی ہوں گی، اماں کا جی ماندہ ہے، اماں سو رہی ہوں گی، اماں جاگتی ہوں گی۔ بہت شوخی نہ کیا کرو، نہیں تو اماں حکیم کے ہاں چلی جادیں گی۔" ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں، کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ ناک میں ننھی سی نتھنی ہے۔ اونچی چوٹی گندھی ہوئی، لال شال باف کا موباف پڑا ہے۔ ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں۔ معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہوئے ہیں۔ کلائیاں دکھی جاتی ہیں۔ کوئی چوڑیاں نہ اتار لے۔ کہیئے پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

لیجئے دوسرے صاحب۔ ایک اور ان کے یار غار بھی ساتھ ہیں۔ فرمائشی گالیاں چل رہی ہیں "اماں پان تو کھاؤ" کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا۔ معلوم ہوا کہ آپ بڑے تونگر ہیں۔ پیسے دو پیسے کی آپ کے آگے کیا اصل ہے۔ فوراً ہی حقے والے کو آواز بھی دے دی۔

"بھئی ساقی ادھر آنا، حقہ سلگا ہوا ہے؟" ایک اور یار ان کے آ موجود ہوئے۔ معمولی گالی گلوچ

کے بعد ملاقات، سلام، بندگی، مزاج پرسی بے تکلف دوستوں میں ہوا کرتی ہے۔ "اسے پان تو کھلوا" لطف یہ کہ آپ مسلمان، یار ہندو۔ جب تنبولی نے پان دیئے جھٹ سے بڑھ کے لے لئے۔ "ارے یار بھول گئے" اب یہ کھسیانے ہوئے۔ مینٹ سے ایک پیسہ نکالا۔ "لو بھئی ہمیں بھی دو پان دینا، الائچی بھی چھوڑ دینا، چونا زیادہ نہ ہو۔" دوست سے "اچھا تو چلم تو پلواؤ گے؟" چلم حقے سے اتارتے ہی تھے کہ ساقی نے گھور کے دیکھا۔ فوراً ہاتھ سے حقہ اور جیب سے پیسہ نکال کے دینا پڑا۔

گوہر مرزا نے موتی جھیل کے کنارے فرش بچھوا دیا تھا وہیں جا کے ٹھہرے۔ ادھر ادھر درختوں میں پھرتے رہے۔ سر شام سے دو گھڑی رات گئے تک میلے کی سیر کی، پھر گھر چلنے کی ٹھہری۔ اپنے اپنے میانوں میں آ کر سوار ہوئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید جان کا میانہ خالی ہے، ان کا کوئی پتا نہیں۔ پہلے تو شبہ ہوا کہ یہیں کہیں درختوں میں ہوں گی۔ دور دور تک تلاش کے لئے آدمی دوڑائے۔ گوہر مرزا نے جا کے سارا میلہ چھان مارا، کہیں پتا نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کے گھر واپس آئے۔ خانم نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ تمام گھر کو صدمہ ہوا۔ میں خود رات بھر رویا کی۔ پیارے صاحب کے مکان پر آدمی گیا۔ بے چارے اسی وقت دوڑے ہوئے آئے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں کہ مجھے بالکل نہیں معلوم۔ میں میلے بھی نہیں گیا۔ بیگم کی طبیعت علیل ہے، جاتا تو کیونکر جاتا۔ پیارے صاحب پر یوں ہی بے جا سا گمان تھا، ان کے قسمیں کھانے کے بعد کسی کو شبہ بھی نہ رہا، وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بیوی کے ایسے پابند ہو گئے تھے کہ چوک کا آنا جانا انہوں نے بالکل موقوف کر دیا تھا۔ رات کو گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ خورشید کے گم ہونے کی خبر سن کے کچھ اگلی محبت کے خیال سے، کچھ خانم کی مروت سے نہیں معلوم کس طرح چلے آئے تھے۔

حصہ دوم

(1)

قیدی الفت صیاد رہا ہوتے ہیں

خورشید کے گم ہونے کے ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک صاحب جن کی وضع شہر کے بانکوں جیسی تھی۔ سانولا رنگ، چھریرا بدن، ایک دوشالہ کمر سے لپیٹے اور ایک سر سے باندھے میرے کمرے میں درانا چلے آئے اور آنے کے ساتھ ہی سامنے قالین کے کنارے بیٹھ گئے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ طبیعت میں کسی قدر کمینہ پن ہے، یا ابھی انیلے ہیں، رنڈیوں کے یہاں جانے کا کم اتفاق ہوا ہے۔ اس وقت میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے بوا حسینی کو آواز دی، وہ کمرے میں آئیں۔ ان کے آتے ہی وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا، علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کیں، جن میں کچھ میں نے سنیں اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد بوا حسینی خانم کے پاس گئیں۔ وہاں سے آنے پر پھر باتیں ہوئیں۔ آخر کلام یہ تھا۔ "آپ کو ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی دینی ہوگی۔" ان صاحب نے کمر سے ہینڈ روپوں کی نکالی، بوا حسینی نے گود پھیلائی، انہوں نے چھن سے روپے پھینک دیئے۔

بوا حسینی:۔ یہ کتنے ہیں؟

وہ صاحب:۔ نہیں معلوم، گن لیجئے۔

بوا حسینی:۔ اے ہے مجھے تو نگوڑا گننا بھی نہیں آتا۔

وہ صاحب:۔ میں جانتا ہوں، پچھتر روپے ہوں گے۔ شاید ایک دو کم ہوں یا زیادہ۔

بوا حسینی:۔ میاں پچھتر کسے کہتے ہیں؟

وہ صاحب۔ تین بیسی اور پندرہ، پچیس کم سو۔

بوا حسینی۔ پچیس کم سو۔ تو یہ کتنے دن کی تنخواہ ہوئی؟

وہ صاحب۔ پندرہ دن کی۔ کل وہ بھی پندرہ دن کی دے دوں گا۔ پورے ڈیڑھ سو نخرچے آپ کو پہنچ جائیں گے۔

یہ "نخرچے" سن کر مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اب تو بالکل ہی یقین ہو گیا کہ کوئی ایسے ہی ویسے ہیں، مگر مجبور، رنڈی کا پیشہ، دوسرے پرائے بس میں، کرتی تو کیا کرتی۔

بوا حسینی روپے لے کے خانم کے پاس گئیں۔ خانم اس وقت نہیں معلوم کس نیکی کے دم میں تھیں کہ فوراً منظور کر لیا۔ بلکہ مجھے تعجب ہوا، اس لئے کہ بڑے سے بڑے رئیس سے روپے کے بارے میں ایک دم کے لئے مروت نہیں کرتی تھیں یا اس وقت ایک دن کا وعدہ مان لیا۔

اس معاملے کے طے ہونے کے بعد وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے۔ کوئی پہر رات باقی ہو گی، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے کمرے کے نیچے آکے دستک دی۔ وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا "لو اب میں جاتا ہوں، کل شب کو پھر آؤں گا"۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں اور تین انگوٹھیاں ایک سونے کی، یاقوت کا نگینہ، ایک فیروزے کی، ایک ہیرے کی مجھ کو دیں اور کہا یہ تم اپنے پاس رکھنا، خانم کو نہ دینا۔ میں نے خوشی خوشی ہاتھ میں پہنیں اور اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ مجھے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ پھر صندوقچہ کھولا، اشرفیاں اور انگوٹھیاں چور خانے میں چھپا کے رکھ دیں۔

دوسرے دن شب کو وہی صاحب پھر آئے۔ اس وقت میں تعلیم لے رہی تھی۔ وہ ایک کنارے آکر بیٹھ گئے۔ گانا ہوا کیا۔ پانچ روپے سازندوں کو دیئے۔ استاد جی اور سارنگئے خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ استاد جی نے کمر میں جو دوشالہ بندھا ہوا تھا، اس کے اینٹھنے کی فکر کی۔ پھر منہ پھوڑ کے مانگا، مگر وار خالی گیا، انہوں نے نہ دیا۔

وہ صاحب۔ استاد جی! روپیہ پیسہ اور جس چیز کو کہئے موجود ہے، یہ دوشالہ میں نہیں دے سکتا، ایک دوست کی نشانی ہے۔

استاد جی اپنا سا منہ لے کے چپ ہو رہے۔

اس کے بعد تعلیم موقوف ہوئی۔ بوا حسینی کو باقی پچھتر گن دیئے گئے۔ پانچ روپے بوا حسینی کو اپنی طرف سے دیئے۔ وہ رخصت ہوئیں۔ جب وہ اور میں صرف دو آدمی کمرے میں رہ گئے، میں نے

پوچھا "آپ نے مجھ کو کہاں دیکھا تھا جو یہ عنایت کی؟"

وہ۔ دو مہینے ہوئے عیش باغ کے میلے میں۔

میں۔ اور پھر آئے دو مہینے کے بعد؟

وہ۔ میں باہر چلا گیا تھا، اور اب پھر جانے والا ہوں۔

اب میں نے رنڈی پنے کی لگاوٹ شروع کی۔

میں۔ تو ہمیں چھوڑ کے چلے جاؤ گے؟

وہ۔ نہیں، پھر بہت جلد چلا آؤں گا۔

میں۔ اور تمہارا مکان کہاں ہے؟

وہ۔ مکان تو فرخ آباد میں ہے، مگر یہاں بہت کام رہتا ہے، بلکہ رہتا یہیں ہوں، کچھ دنوں کے لئے باہر چلا جاتا ہوں، پھر چلا آتا ہوں۔

میں۔ اور یہ دوشالہ کس کی نشانی ہے؟

وہ۔ کسی کی نہیں۔

میں۔ واہ! میں سمجھ گئی، یہ تمہاری آشنا کی نشانی ہے۔

وہ۔ نہیں، تمہارے سر کی قسم! میری کوئی آشنا واشنا نہیں ہے، بس تمہی ہو جو کچھ ہو۔

میں۔ تو پھر مجھے دے دو۔

وہ۔ میں نہیں دے سکتا۔

یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اتنے میں انہوں نے بڑے بڑے موتیوں کی مالا جس میں زمرد کی ہڑیں لگیں ہوئی تھیں اور ایک جوڑی ہیرے کے کڑے کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی میرے آگے رکھ دیں۔ یہ سب تو میں نے خوشی خوشی اٹھا لیا۔ صندوقچہ کھول کے بند کرنے لگی، مگر مجھے تعجب ہوا کہ یہ ہزاروں کی رقم تو یوں مجھ کو دے دیتے ہیں، مگر یہ دوشالہ زیادہ سے زیادہ پانسو کا ہو گا، اس سے کیوں انکار کیا۔ واقعی مجھ کو دوشالہ پسند نہ تھا جو میں زیادہ اصرار کرتی۔ اپنے کام سے کام تھا۔

ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔ پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے، اور کبھی آدھی رات کو، کبھی پچھلے پہر سے اٹھ کے چلے جاتے تھے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں کئی مرتبہ دستک یا سیٹی کی آوازیں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ فیض علی سے رسم ہوئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گزرا ہو گا کہ میرا صندوقچہ سادے اور جڑاؤ گہنے سے بھر گیا۔ اشرفیوں اور روپوں کا شمار نہیں۔ اب میرے پاس

خانم اور بوا حسینی سے چھپا ہوا دس بارہ ہزار کا مال ہو گیا تھا۔

فیض علی سے اگر مجھ کو محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی۔ اور نفرت ہونے کی کیا وجہ! اول تو وہ کچھ بدصورت بھی نہ تھے۔ دوسرے لینا دینا عجب چیز ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جب تک وہ نہ آتے، میری آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتی تھیں۔ گوہر مرزا کی آمد و رفت ان دنوں صرف دن کی رہ گئی تھی۔ شب کے آنے والوں میں سے بھی اکثر لوگ سمجھ گئے تھے کہ میں کسی کی پابند ہو گئی ہوں۔ اس لئے سویرے سے کھسک جاتے تھے۔ اور جو صاحب جم کے بیٹھتے تھے ان کو میں کسی حیلے سے ٹال دیتی تھی۔

خورشید کی تلاش بہت کچھ ہوئی مگر کہیں سراغ نہ ملا۔ اس اثنا میں فیض علی کئی مرتبہ دو دو تین تین دن تک غائب رہے اور پھر چلے آئے۔ واقعی فیض علی کو مجھ سے بہت محبت تھی، جس کا اظہار طرح طرح سے ہوتا۔ اگر میرا دل ابتدا سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہو گیا ہوتا تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی۔ اس پر بھی میں نے ان کی دل جوئی اور ظاہرداری میں کسی طرح کمی نہیں کی۔ میں نے فیض علی کو فریب دے رکھا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور وہ بے چارہ میرے دام میں پھنسا ہوا تھا۔ جو کچھ خفیہ اس نے مجھ کو دیا اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ خانم اور بوا حسینی کے کہنے سے مجھے فرمائشیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ ان کی بجا آوری کو بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کو روپے پیسے کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایسا دل چلا آدمی نہ میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں۔

رسوا۔ جی ہاں کیوں نہیں، مال مفت دل بے رحم، بھلا اس کے برابر کس کا دل ہو سکتا ہے؟

امراؤ۔ مال مفت کیوں!

رسوا۔ نہیں تو اپنی اماں جان کا زیور روز آپ کو اتار اتار کے لا دیا کرتا تھا؟

امراؤ۔ ہمیں کیا معلوم تھا۔

شب کے آنے والوں میں ایک پنالال جوہری تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ان کو چار آدمیوں میں بیٹھنے کا مزا تھا۔ اگر ان کی خاطر داری ہوتی رہے تو اور کسی کے آنے جانے سے انہیں کچھ غرض نہ تھی۔ مہینے میں دو سو روپے کا نقد سلوک اور فرمائشوں کا ذکر نہیں۔ فیض علی کی ملاقات کے زمانے میں ان کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔ یا تو ہر روز آیا کرتے یا دوسرے تیسرے دن آنے لگے۔ پھر ایک مرتبہ پندرہ دن کا غوطہ لگایا، اب جو آئے تو کچھ اداس اداس۔ معمولی باتوں کا

جواب دیتے ہیں اور پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں نے سبب پوچھا۔

پنالال۔ کیا تم نے سنا نہ ہو گا؟

میں۔ کیا؟

پنالال۔ ہم تو تباہ ہو گئے، گھر میں چوری ہو گئی پشتینیوں کا سب اثاثہ اٹھ گیا۔

میں۔ (چونک کے) ہائیں! چوری ہو گئی؟ کتنے کا مال گیا؟

پنالال۔ سب اٹھ گیا، رہا کیا، دو لاکھ کا جواہر اٹھ گیا۔

میں دل میں ہنسی۔ ہنسی اس بات پر کہ ان کے باپ چھنالال تو کروڑ پتی مشہور تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دو لاکھ بہت بڑی رقم ہے، مگر ان کے نزدیک کیا اصل ہے۔ بہ ظاہر منہ بنا کے بہت افسوس کیا۔

پنالال۔ جی ہاں، آج کل شہر میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ نواب ملکہ عالم کے ہاں چوری ہوئی، لالہ گوہر پرشاد کے ہاں چوری ہوئی۔ اندھیر ہے۔ سنا ہے باہر سے چور آئے ہوئے ہیں۔ مرزا علی رضا بیگ بے چارے حیران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہو گئے تھے، کسی سے کچھ پتا نہیں ملا۔ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں۔

پنالال کے آنے کے دوسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں کہ چوک میں ایک شور ہوا۔ میں بھی چلمن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو خلائق کا انبوہ ہے۔

ایک۔ آخر گرفتار ہوئے نا؟

دوسرا۔ واہ مرزا، کیا کہنا! کوتوال ہو تو ایسا ہو۔

تیسرا۔ کیوں بھئی کچھ مال کا پتا بھی لگا؟

چوتھا۔ بہت کچھ برآمد ہوا، مگر ابھی بہت سا باقی ہے۔

پانچواں۔ میاں فیضو بھی گرفتار ہوئے؟

چھٹا۔ وہ کیا آتے ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں فیضو بندھے چلے آتے ہیں۔ سپاہیوں کا گارد ساتھ ہے، گرد خلائق کا انبوہ ہے۔ میاں فیضو منہ پر دوپٹا ڈالے ہوئے ہیں، ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ دو پہر سے پہلے کا واقعہ ہے۔

حسب معمولی فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہیں۔

آتے ہی کہا "آج ہم باہر جاتے ہیں، پرسوں آئیں گے۔ دیکھو! امراؤ جان، جو کچھ ہم نے دیا ہے، اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ نہ بوا حسینی کو دینا نہ خانم کو دکھانا۔ تمہارے کام آئے گا۔ ہم پرسوں ضرور آئیں گے۔ اچھا یہ کہو کہ ہمارے ساتھ تھوڑے دنوں کے لئے باہر چل سکتی ہو؟"

میں۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنے بس میں نہیں۔ خانم صاحب کو اختیار ہے، تم ان سے کہو۔ اگر وہ راضی ہوں تو مجھے کیا عذر ہے۔

فیض علی۔ سچ ہے۔ تم لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ ہم تو تم پر جان دیتے ہیں اور تم ایسا خشک جواب دیتی ہو۔ اچھا بوا حسینی کو بلواؤ۔

میں نے بوا حسینی کو آواز دی، وہ آئیں۔

فیض علی۔ (میری طرف اشارہ کر کے) بھلا کچھ دنوں کے لئے باہر بھی جا سکتی ہیں؟

حسینی۔ کہاں؟

فیض علی۔ فرخ آباد۔ میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میری وہاں ریاست ہے۔ بالفعل میں دو مہینے کے لئے وہاں جاتا ہوں۔ اگر خانم صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی، بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔

بوا حسینی۔ مجھے تو نہیں یقین کہ خانم منظور کریں گی۔

فیض علی۔ اچھا تم پوچھو تو۔

بوا حسینی خانم کے پاس گئیں۔

میرے نزدیک بوا حسینی کو خانم کے پاس بھیجنا بے کار تھا اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ وہ ہرگز منظور نہ کریں گی۔

فیض علی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا تھا کہ اگر میں اپنے اختیار میں ہوتی تو مجھے ان کے ساتھ جانے میں کچھ بھی عذر نہ ہوتا۔ میں یہ خیال کرتی تھی کہ جب اس شخص نے گھر بیٹھے اتنا سلوک کیا تو وطن جا کر نہال کر دے گا۔ میں اسی خیال میں تھی کہ اتنے میں بوا حسینی نے آکر صاف جواب دے دیا۔ "ان کا باہر جانا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔"

فیض علی۔ دگنی تنخواہ پر سہی!

بوا حسینی۔ چوگنی تنخواہ پر بھی نہیں ممکن۔ ہم لوگ باہر نہیں جانے دیتے۔

فیض علی۔ خیر، جانے دو......

(بوا حسینی چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ یہ حال دیکھ کے مجھے بہت ہی ترس آیا)۔

معشوقوں کی بے وفائیوں کا تذکرہ قصے کہانیوں میں جب سنتی تھی تو مجھے افسوس ہوتا تھا، برا کہتی تھی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر اس کا ساتھ نہ دیا، تو میری بے وفائی اور احسان فراموشی میں کوئی شبہ نہیں۔

میں نے دل میں ٹھان لیا کہ میں اس شخص کا ضرور ساتھ دوں گی۔

میں۔ اچھا تو میں چلوں گی۔

فیض علی۔ چلو گی؟

میں۔ کوئی جانے دے یا نہ جانے دے، میں ضرور چلوں گی۔

فیض علی۔ کیوں کر؟

میں۔ چھپ کے۔

فیض علی۔ اچھا تو پرسوں رات کو ہم آئیں گے۔ پہر بھر رات رہے تمہیں یہاں سے نکال لے چلیں گے۔ دیکھو دغا نہ دینا، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

میں۔ میں اپنی خوشی سے چلنے کو کہتی ہوں۔ تم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ میرے وعدے کو بھی دیکھنا۔

فیض علی۔ بہت اچھا، دیکھا جائے گا۔

اس رات فیض علی کوئی ڈیڑھ پہر رات رہے میرے پاس سے اٹھ کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں دل میں غور کرنے لگی۔ وعدہ تو کر لیا مگر دیکھیے ہوتا کیا ہے۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔

جب فیض علی کی محبت اور اپنے وعدے کا خیال آتا تھا تو دل کہتا تھا جانا چاہیے، مگر پھر جیسے کوئی منع کرتا تھا کہ نہ جاؤ، خدا جانے کیا ہو، کیا نہ ہو۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی۔ کوئی بات طے نہ ہوئی۔ دن بھر یہی باتیں دل میں رہیں۔ رات کو اتفاق سے میرے پاس کوئی نہ آیا، کمرے میں اکیلی اسی فکر میں رہی، آخر نیند آ گئی۔ صبح کو ذرا دن چڑھے تک سویا کی۔ گوہر مرزا نے کچی نیند میں جھنجھوڑ کے اٹھا دیا۔ مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ دن بھر نشے کا سا خمار رہا۔ نہیں معلوم کس بات پر بوا حسینی سے الجھن ہو گئی۔ ہاں خوب یاد آیا، بات یہ تھی کہ کہیں باہر سے مجرا آیا تھا۔ بوا حسینی نے مجھ سے کہا "جاؤ گی؟" اس وقت میرے سر میں درد ہو رہا تھا، میں نے صاف انکار کر دیا۔ بوا حسینی نے کہا "واہ جب نہ تب انکار کر دیتی ہو، آخر اس پیشے میں ہو کر کیا

کروگی؟" میں نے کہا "میں تو نہ جاؤں گی۔" بوا حسینی نے کہا "نہیں، جانا ہو گا۔ خاص تمہاری فرمائش ہے، اور خانم صاحب نے وعدہ کر لیا ہے اور روپیہ بھی لے لیا ہے۔" میں نے کہا "بوا! میں نہیں جانے کی، روپیہ پھیر دو۔"

بوا حسینی:۔ بھلا تم جانتی ہو، خانم صاحب روپیہ لے کے کبھی پھیرتی ہیں؟

میں:۔ چاہے کسی کی طبیعت اچھی ہو چاہے نہ اچھی ہو! اگر خانم صاحب روپیہ نہ پھیریں گی تو میں اپنے پاس سے پھیر دوں گی۔

بوا حسینی:۔ آہا! اب تم بڑی روپے والی ہو گئی ہو۔ لاؤ پھیر دو۔

میں:۔ کتنا روپیہ ہے؟

بوا حسینی:۔ سو روپے۔

میں:۔ سو روپے لوگی یا کسی کی جان؟

بوا حسینی کو بھی اس دن خدا جانے کہاں کی ضد چڑھ گئی تھی۔

بوا حسینی:۔ بڑی کھری ہو تو دے دو۔

میں:۔ شام کو دے دوں گی۔

بوا حسینی:۔ وہاں باہر کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ شام تک کے لئے کیوں مانیں گے؟

بوا حسینی اپنے دل میں یہ سمجھی تھیں کہ اس کے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ اگر اس وقت اس حیلے سے تنگ کی جائے گی تو خواہ نخواہ مجرے پر راضی ہو جائے گی۔ میرے صندوقچے میں اس وقت کچھ نہ ہوں گے تو ہزار ڈیڑھ ہزار کی اشرفیاں تھیں، زیور کا ذکر نہیں۔ مگر اس وقت بوا حسینی کے سامنے صندوقچہ کھولنا مناسب نہ تھا۔

میں:۔ جاؤ گھنٹے بھر میں لے جانا۔

بوا حسینی:۔ گھنٹے بھر میں کیا مؤکل دے جائیں گے؟

میں:۔ ہاں دے جائیں گے۔ جاؤ بھئی، اس وقت دق نہ کرو۔ میری طبیعت اچھی نہیں۔

بوا حسینی:۔ آخر کچھ کہہ تو لڑکی کیا ہوا؟

میں:۔ مجھے بخار کی سی حرارت ہے اور سر میں شدت سے درد ہو رہا ہے۔

بوا حسینی:۔ (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا) ہاں سچ تو ہے، پنڈا پھیکا ہے، مگر مجرے کو تو کہیں پرسوں جانا ہو گا، جب تک خدا نہ کرے کیا طبیعت کا یہی حال رہے گا۔ روپے کیوں پھیرے

جائیں۔

میں اس بات کا کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھ کے چل دیں۔ بوا حسینی کی اس ہماہمی سے مجھے بہت ہی غصہ معلوم ہوا۔ اسی وقت دل میں بدی آ گئی۔ دل نے کہا واہ جی، جب ان لوگوں کو ہمارے دکھ بیماری کا خیال نہیں، اپنے مطلب سے مطلب ہے، تو ان لوگوں کے ساتھ رہنا بیکار ہے۔

رسوا۔ کبھی پہلے بھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا تھا۔

امراؤ:۔ کبھی نہیں۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا۔ اس لئے کہ فیض علی نے جو وہ سہارا دیا تھا اسی سے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔

امراؤ۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔

رسوا۔ کھلی ہوئی بات تو ہے، مگر اس میں ایک باریکی بھی ہے۔

امراؤ:۔ وہ باریکی کیا ہے، خدا کے لئے جلدی کہیئے؟

رسوا۔ فیض علی کے ساتھ نکل چلنا وعدہ کرنے سے پہلے آپ کے دل میں ٹھن گیا تھا اب دل بہانے ڈھونڈ رہا تھا کہ کیوں کر نکل چلوں۔

امراؤ:۔ نہیں یہ بات نہ تھی۔ میں دو دلی ہو رہی تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ گوہر مرزا کے بے وقت چھیڑنے اور بوا حسینی کی زبردستی سے میں نے جانے کا قصد کر لیا تھا۔ بلکہ اس وقت تک کچھ یوں ہی سا ارادہ تھا۔ جب رات کو فیض علی آئے تو ان کی صورت اور مستعدی دیکھ کے پکا ارادہ ہو گیا۔

رسوا۔ جی نہیں، پہلے ہی سے قصد مصمم ہو چکا تھا اسی لئے گوہر مرزا کا چھیڑنا اور بوا حسینی کی ضد آپ کو بری معلوم ہوئی، ورنہ یہ معمولی باتیں تھیں۔ ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہو گا۔

امراؤ:۔ میں نے مانا کہ ایسا ہی ہو گا اچھا پھر وہ منع کرنے والا کون تھا؟ میں سچ کہتی ہوں کہ چلتے چلتے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہے "امراؤ نہ جا کہا مان" جس وقت دو تین زینے اتر چکی ہوں اس وقت تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ہاتھ پکڑ کے کھینچے لیتا ہے کہ نہ جا مگر میں نے نہ مانا۔

رسوا۔ یہ روکنے والا بڑا زبردست تھا۔ اسی کا حکم نہ ماننے کی تو آپ نے سزا بھگتی۔

امراؤ۔ اچھا میں سمجھی! یہ وہ چیز ہے جو نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

رسوا۔ جی نہیں، یہ وہ نہیں تھی۔ خانم کے مکان پر رہنا کون سا اچھا کام تھا۔ آپ کی باتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ بدکاری کو ہمیشہ برا سمجھتی رہی ہیں، اگرچہ آپ کی حالت نے آپ کو اس کے کرنے پر مجبور کیا ہو۔ پھر خانم کے مکان پر رہنے سے ایک شخص کا ساتھ دے کے اس کا پابند ہو جانا بدرجہا بہتر تھا۔ بات یہ تھی کہ فیض علی کے حسن سلوک نے آپ کو اس کے ساتھ نکل چلنے کی ترغیب دی تھی۔ قیافہ شناسی کے شوق اور اس میں کسی قدر ملکہ ہو جانے سے آپ اچھی خاصی مردم شناس ہو گئی تھیں۔ عیش باغ کے میلے میں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا حال میں نے بڑے شوق سے سنا تھا۔ فیض علی کے کرتوت آپ پر ظاہر نہ تھے، مگر اس کی شکل و شمائل، رفتار و گفتار سے آپ کے دل کو آگاہی ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہے۔ مگر اس کی فریب کی باتوں اور روپے کے لالچ نے آپ کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔ افسوس! اگر آپ علم مردم شناسی کے اصول سے واقف ہوتیں تو کبھی اس کے دام میں نہ آتیں۔

امراؤ۔ میں پڑھوں گی، کسی کتاب کا نام لیجئے۔

خانم کا مکان چوک میں بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ پچھم کی طرف بازار ہے، اتر دکھن اونچی اونچی رنڈیوں کے کمرے ہیں۔ ایک بیبا جان کا مکان ہے، دوسری طرف حسین باندی رہتی ہے۔ پچھواڑے میں حسین علی صاحب کا دیوان خانہ ہے۔ غرضیکہ کسی جانب سے چور کا لگاؤ نہیں ہے۔ اس پر بھی تین پاسی نوکر تھے جو رات بھر کوٹھوں پر پھرتے رہتے تھے۔ جب سے فیض علی کی آمد و رفت شروع ہوئی، مکا پاسی خاص میرے کمرے کے دروازے پر رہتا تھا، کیونکہ فیض علی رات گئے آیا کرتے تھے اور پھر پہر رات چلے جاتے تھے دروازے بند کرنے اور قفل لگانے کے لئے مکا مقرر کیا گیا تھا۔

شب کو حسب وعدہ فیض علی آئے۔ تھوڑی دیر تک چپکے چپکے نکلنے کے مشورے ہوا کئے۔ اتنے میں مکا نے انگڑائی لی، معلوم ہوا کہ جاگ رہا ہے۔ فیض علی نے اسے کمرے میں بلایا، ایک روپیہ جیب سے نکال کے دیا، کہا "جاؤ کولی کی دکان سے اس کی امرتیاں لے آؤ، اور اے لو یہ روپیہ انعام لو۔ تم کو ہم نے کچھ نہیں دیا تھا۔ دروازہ بھیڑ دینا، ہم جاگ رہے ہیں۔ کوئی ڈر نہیں۔"

مکا سلام کر کے کمرے کے باہر نکلا۔ فیض علی نے کہا، لو اب چلو۔ میں اٹھی، دو جوڑے کپڑے دن ہی سے گٹھری میں باندھ رکھے تھے، زیور کا صندوقچہ میں نے پہلے ہی کھسکا دیا تھا۔ گٹھری بغل میں دبائی۔ اکبری دروازے کی طرف کا راستہ لیا۔ نخاس میں بیل گاڑی پہلے سے ہی کھڑی کی گئی تھی۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چل نکلے۔ ہنڈولنے کے ناکے سے تھوڑی دور جا کے فیض علی کا سائیس گھوڑا لئے ہوئے ملا، وہ بھی بہل کے ساتھ ہو لیا۔ صبح ہوتے ہوتے موہن لال گنج پہنچے۔ یہاں سرا میں دوپہر تک قیام ہوا بھٹیاری سے کھانا پکوا کے کھایا۔

دال ارہر کی بے نمک پھیکی
مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

تیسرے دن رائے بریلی میں داخل ہوئے۔ یہاں سفر کے مناسب کپڑا خریدا۔ میرے دو جوڑے بنوائے۔ لکھنو سے جو کپڑے پہن کے آئی تھی، اتار کے گٹھری میں باندھے۔ رائے بریلی سے بیل گاڑی کو جو لکھنو سے آئی تھی، رخصت کیا۔ دوسری گاڑی کرایہ کی، لال گنج کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قصبہ رائے بریلی سے کوئی نو دس کوس کے فاصلے پر ہے۔ شاموں شام پہنچ گئے۔ رات سرائے میں رہے۔ فیض علی ضروری سودے سلف کے لئے بازار گئے۔ جس کوٹھری میں ہم تھے اس کے پاس والی کوٹھری میں ایک دیہاتی رنڈی اتری ہوئی تھی۔ نصیبن نام تھا۔ گہنے پاتے سے درست تھی، کپڑے بھی اچھے تھے۔ تھی تو دیہاتی مگر زبان بہت صاف تھی۔ لب و لہجہ قصباتیوں کا ایسا تھا۔ میری اس کی دیر تک باتیں ہوا کیں۔

نصیبن۔ آپ کہاں سے آئی ہیں؟

میں:۔ فیض آباد سے۔

نصیبن۔ فیض آباد میں تو میری بہن پیارن رہتی ہے، آپ ضرور جانتی ہوں گی۔

میں:۔ (آخر پہچان گئی نا کہ میں بھی رنڈی ہوں) میں کیا جانوں۔

نصیبن۔ فیض آباد میں کون ایسی پتریا ہے جو ہم کو نہیں جانتی۔

میں:۔ بہت دنوں سے ان کے گھر بیٹھ گئی ہوں۔ یہ لکھنو میں رہتے ہیں، اسی لئے میں بھی اکثر وہیں رہتی ہوں۔

نصیبن۔ آخر پیدائش تو تمہاری فیض آباد کی ہے نا؟

میں:۔ (یہ تو بالکل سچ کہتی ہے، اب کیا جواب دوں) ہاں پیدا تو وہاں ہوئی، مگر بچپنے سے باہر

رہی۔

نصیبن:۔ تو فیض آباد میں کسی کو نہیں جانتیں؟

میں:۔ کسی کو نہیں۔

نصیبن:۔ یہاں کیوں کر آنا ہوا؟

میں:۔ ان کے ساتھ ہوں۔

نصیبن:۔ اور جاؤ گی کہاں؟

میں:۔ آناؤ۔

نصیبن:۔ لکھنؤ ہوتی ہوئی آئی ہو؟

میں:۔ ہاں۔

نصیبن:۔ پھر سیدھا رستہ چھوڑ کے ادھر بہیڑ میں کہاں آئی ہو، نرپت گنج ہو کے اناؤ چلی گئی ہوتیں؟

میں:۔ رائے بریلی میں ان کو کچھ کام تھا۔

نصیبن:۔ میں نے اس لئے کہا کہ ادھر کا راستہ بہت خراب ہے۔ ڈاکوؤں کے مارے مسافروں کی آمد و رفت بند ہے۔ پلیہ کی بہیڑ میں سینکڑوں کو لوٹ لیا۔ آناؤ کا رستہ ادھر ہی سے ہو کے ہے۔ تم تین آدمی ہو جس میں دو مرد ایک عورت ذات۔ تمہارے گلے میں گہنا بھی ہے۔ بھلا تمہاری کیا حقیقت ہے، وہاں تو براتیں لٹ جاتی ہیں۔

میں:۔ تن بہ تقدیر۔

نصیبن۔ بڑی دل کی کڑی ہو۔

میں۔ پھر کیا کروں!

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں جن کا دہرانا کوئی ضروری نہیں اور نہ ہی مجھے یاد ہیں۔

ہاں میں نے پوچھا۔

میں:۔ تم کہاں جاؤ گی؟

نصیبن:۔ ہم تو گدائی کو نکلے ہیں۔

میں:۔ میں نہیں سمجھی؟

نصیبن:۔ اے لو گدائی نہیں جانتیں، کیسی پتریا ہو؟

میں:۔ بہن میں کیا جانوں، گدائی تو بھیک مانگنے کو کہتے ہیں۔

نصیبن:۔ ہمارے دشمن بھیک مانگیں۔ اور سچ پوچھو تو کہوں، پتریا کی ذات بھیک منگنی ہے، اس میں ڈیرے دار ہو، یا نہ ہو۔

میں:۔ یہ تو سچ ہے، مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ گدائی کسے کہتے ہیں۔

نصیبن:۔ سال میں ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ امیروں، رئیسوں کے مکان پر جا کے اترتے ہیں۔ جو کچھ جس کے مقدور میں ہوتا ہے، ہمیں دیتا ہے۔ کہیں مجرا ہوتا ہے، کہیں نہیں ہوتا۔

میں:۔ اچھا اس کو گدائی کہتے ہیں؟

نصیبن:۔ ہاں، اب سمجھیں۔

میں:۔ یہاں کسی رئیس کے پاس آئی ہوئی ہو؟

نصیبن:۔ یہاں سے تھوڑی دور پر شیو دھیان سنگھ ایک راجا کی گڑھی ہے، انہی کے پاس گئی تھی۔ راجا صاحب کو بادشاہی حکم پہنچا ہے، ڈاکوؤں کے بندوبست کو گئے ہوئے ہیں۔ کئی دن ٹھہری رہی، آخر دم گھبرایا۔ یہاں سے دو کوس پر ایک گاؤں ہے سمریہا، وہ گاؤں بالکل پتریوں کا ہے۔ وہاں میری خالہ رہتی ہیں۔ کل ان کے پاس جاؤں گی۔

میں:۔ پھر کہاں جاؤ گی؟

نصیبن:۔ وہیں ٹھہری رہوں گی۔ جب راجا صاحب آجائیں گے تو پھر گڑھی کو جاؤں گی۔ اور بہت سے ڈیرے بھی ان کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں:۔ کیا راجا صاحب کو ناچ مجرے سے بہت شوق ہے؟

نصیبن:۔ بہت شوق تھا۔

میں:۔ کیوں اب کیا ہوا؟

نصیبن:۔ جب سے ایک پتریا لکھنؤ سے لائے ہیں ہم لوگوں کی کوئی قدر نہیں رہی۔

میں:۔ اس پتریا کا کیا نام ہے؟

نصیبن:۔ نام تو مجھ کو یاد نہیں، صورت دیکھی ہے۔ گوری گوری سی ہے۔ ذرا چہرے مہرے کی اچھی ہے۔

میں:۔ گاتی تو خوب ہو گی؟

نصیبن۔ خاک! گانا وانا کچھ نہیں آتا۔ ہاں ناچتی ذرا اچھا ہے۔ راجا صاحب اسی پر لٹو ہیں۔

میں۔ کتنے دنوں سے وہ پتریا آئی ہے؟

نصیبن۔ کوئی چھ مہینے ہوئے ہوں گے۔

رات کو میں نے فیض علی سے راستے کی خرابی کا حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا "خاطر جمع رکھو ہم نے بندوبست کر لیا ہے۔"

دوسرے دن منہ اندھیرے ہم لال گنج کی سرائے سے روانہ ہوئے۔ نصیبن کی گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ فیض علی گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم اور نصیبن باتیں کرتے جاتے تھے۔ تھوڑی دور چل کے سمر یہا ملا۔ نصیبن نے دور سے ہم کو وہ گاؤں دکھایا۔ سڑک کے کنارے کھیت تھے۔ ان میں کچھ گنوارنیاں پانی دے رہی تھیں، کچھ کھیت نرا رہی تھیں۔ ایک پرائی چل رہی تھی۔ اس میں ایک مسنڈی عورت دھوتی باندھے بیل ہنکا رہی تھی۔ ایک پرنے رہی تھی۔ نصیبن نے کہا یہ سب پتریاں ہیں۔ میں نے دل میں کہا واہ یہ پیشہ بھی کیا، پھر اس قدر محنت جو مردوں سے بمشکل ہو۔ آخر ان کو پتریا ہونا کیا ضرور تھا۔ مگر ان کی صورتیں بھی ایسے ہی کاموں کے لائق ہیں۔ لکھنؤ میں کنڈے والیاں، دہی والیاں، گھوسنیں آتی ہیں، ان کی شکل بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نصیبن یہاں سے رخصت ہوئی۔

کوئی دو کوس اور جا کے ایک نشیب ملا۔ جا بجا بھرے، بڑے بڑے غار۔ سامنے ندی کا کنارہ نظر آیا۔ دونوں طرف دور تک گنجان درختوں کی قطار تھی۔ جب ہم اس موقع پر پہنچے ہیں، دھوپ اچھی طرح نکل چکی تھی، کوئی پہر دن چڑھا ہو گا۔ اس سڑک پر سوا ہمارے اور کوئی راستہ چلتے دکھائی نہ دیتا تھا، چاروں طرف سناٹا تھا۔ ندی کے پاس پہنچ کے فیض علی نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ میں روکتی کی روکتی رہ گئی، وہ یہ جادہ جا بہت دور نکل گئے۔ تھوڑی دور تک گھوڑا نظروں سے غائب رہا، پھر ندی کے پار جاکے معلوم ہوا۔ ہماری گاڑی اسی طرح چلی جاتی تھی۔ گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا، سائیں گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا گیا تھا۔ اب میں ہوں اور گاڑی بان ہے۔ اتنے میں میں نے دور سے دیکھا کہ دس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا خدا خیر کرے! تھوڑی دیر میں گنواروں نے آکر گاڑی کو گھیر لیا۔ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے، بندوقیں کندھے پر تھیں، توڑے سلگ رہے تھے۔

گنوار۔ (گاڑی بان سے) گاڑی روک۔ کون ہے گاڑی میں؟

گاڑی بان۔ یہ سواری بریلی سے آئی ہے، آنلؤ کا بھاڑا کیا ہے۔

گنوار۔ روک گاڑی۔

گاڑی بان۔ گاڑی کیوں روکیں، خان صاحب کے ہاں کی زنانی سواری ہے۔

گنوار۔ کوئی مرد ساتھ نہیں ہے؟

گاڑی بان۔ مرد آگے بڑھ گئے ہیں، آتے ہوں گے۔

گنوار۔ اترو بی بی گاڑی سے؟

ایک۔ پردہ کھول کے کھینچ لو یار۔ کسبی پتریا تو ہے، اس کا پردہ کیسا۔

ایک گنوار آگے بڑھا، گاڑی کا پردہ الٹ کے مجھے گاڑی سے اتارا۔ تین آدمی مجھے گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ندی کی طرف سے گرد اٹھی اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ جب گھوڑے قریب آئے، میں نے دیکھا آگے فیض علی کا گھوڑا ہے، پیچھے اور دس پندرہ سوار ہیں۔ گنواروں نے دیکھتے ہی بندوقوں کی ایک باڑھ ماری۔ اس میں دو سوار ادھر سے گر پڑے۔ پھر تلواریں میان سے نکلیں۔ سوار سر پر ہی آ گئے تھے۔ ادھر سے بھی تلواریں کھنچ گئیں۔ دو ایک ہاتھ چلے ہوں گے۔ تین گنوار ادھر سے زخمی ہو کے گرے اور ادھر سے ایک سوار گرا۔ گنوار بھاگ نکلے۔ "اچھا کہاں جاؤ گے۔ دیکھو ندی کے اس پار کیا ہوتا ہے۔"

گنواروں کے جانے کے بعد میں پھر گاڑی میں بیٹھی۔ جس سوار کے زخم آیا تھا اس کے پٹیاں کسی گئیں۔ وہ بھی گاڑی میں میرے ساتھ بٹھایا گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ اب دو سوار ہماری گاڑی کے ادھر ادھر ہیں۔ کچھ سوار آگے ہیں، کچھ پیچھے ہیں۔

فیض علی۔ (اپنے ساتھی سے) بھائی فضل علی کسی طرح لکھنؤ سے نکلنا ہی نہ ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کے آیا ہوں۔

فضل علی۔ یہ نہیں کہتے عیش میں پڑے تھے۔

فیض علی۔ ہاں یہ تو کہو گے۔

فضل علی۔ کہیں گے کیا، تحفہ بھی تو ساتھ ساتھ ہے۔ ذرا بھابھی صاحب کو ہم بھی تو دیکھیں۔

فیض علی۔ آپ سے کوئی پردہ ہے، دیکھئے۔

فضل علی۔ ڈیرے پر چل کے بامراد دیکھیں گے۔

اتنے میں گاڑی ندی کے کنارے پہنچ گئی۔ کنارا بہت اونچا تھا، مجھ کو گاڑی سے اتر کر پیدل چلنا

پڑا۔ بڑی مشکل سے گاڑی دوسرے کنارے تک پہنچی۔ جو زخمی سوار گاڑی پر تھا اس کے زخم گاڑی کی تکان سے کھل گئے تھے۔ تمام گاڑی میں خون ہی خون تھا۔

ندی اس پار جا کے زخم پھر سے باندھے گئے۔ گاڑی دھوئی گئی۔ پھر میں گاڑی میں سوار ہوئی۔ اب قریب دوپہر کے دن آچکا تھا۔ مجھے شدت سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ گاڑی اسی طرح چل رہی تھی۔ ان لوگوں کا ڈیرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ندی سے کوئی چار کوس پر جا کے ایک گاؤں کے پاس باغ تھا، اس میں چھولداریاں پڑی ہوئی تھیں، گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا پکا رہے تھے۔ یہاں آکر ہماری گاڑی رکی۔ ہمارے ساتھ کے سواروں کو دیکھتے ہی ایک آدمی اس پڑاؤ سے دوڑ کے آگے بڑھا۔ اس نے کچھ فضل علی کے کان میں کہا۔ فضل علی کے چہرے سے تشویش کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ وہ فیض علی کے پاس گھوڑا بڑھا کے آئے، فیض علی سے چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔

فیض علی۔ اچھا دیکھا جائے گا، کھانا تو کھا لو۔

فضل علی۔ کھانا کھانے تک کی مہلت نہیں ہے، ایسے میں نکل چلو۔

فیض علی۔ اچھا جب تک چھولداریاں اکھاڑی جائیں، گھوڑوں پر زین کسے جائیں، ہم لوگ کھانا کھا لیں۔

میں گاڑی سے اتری۔ ایک آم کے درخت کے نیچے دری بچھا دی گئی، سالن کی پتیلیاں لا کے رکھی گئیں۔ تھئی کی تھئی روٹیاں موٹی موٹی ٹوکریوں میں آئیں۔ میں، فیض علی اور فضل علی تین آدمیوں نے مل کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت اگرچہ چہروں پر تشویش کے آثار تھے، مگر ہنسی مذاق ہوتا جاتا تھا۔

جتنی دیر میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا، چھولداریاں اکھاڑ کے ٹٹوؤں پر لاد دی گئیں زین کسے گئے۔ آخر قافلہ چل نکلا۔

دو ہی تین کوس گئے ہوں گے کہ بہت سے سوار اور پیدلوں نے آکر گھیر لیا۔ ادھر بھی سب پہلے سے مستعد تھے۔ دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ اس لڑائی میں فیض علی میری گاڑی کے آس پاس رہے۔ میں گاڑی کے اندر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہوں، کلیجہ ہاتھوں اچھل رہا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گاڑی کا پردہ کھول کے دیکھ لیتی ہوں۔ یہ گرا وہ مرا۔ آخر دونوں طرف سے بہت سے زخمی ہوئے۔ ہمارے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے، راجا شیو دھیان سنگھ کے آدمی بہت

تھے۔ ایک پر دس ٹوٹ پڑے، بہت زخمی ہوئے۔ فضل علی اور فیض علی موقع پا کر نکل گئے۔ دس بارہ آدمی گرفتار ہوئے۔ انہی گرفتاروں میں میں بھی تھی۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے بعد گاڑی بان نے منت سماجت کر کے رہائی حاصل کی۔ زخمی سوار کو میدان میں ڈال دیا، جہاں اور لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو اپنی جان لے کے راستے بریلی کی طرف روانہ ہوا۔ مردوں کی مشکیں کسی گئیں، گڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔ گڑھی وہاں سے کوئی چار پانچ کوس تھی۔ تھوڑی دور جا کے راجا صاحب اور ان کے ساتھ کے اور لوگ ملے۔ راجا صاحب گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم لوگ سامنے گئے۔ میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

راجا۔ یہی بی لکھنؤ سے آئی ہیں؟

میں:۔ (ہاتھ باندھ کے) حضور! قصور دار ہوں، لیکن اگر غور کیجئے تو ایسا قصور بھی نہیں۔ عورت ذات، جعل فریب سے آگاہ نہیں۔ میں کیا جانتی تھی؟

راجا۔ اب اپنی بے قصوری ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ قصور آپ کا ثابت ہے۔ جو باتیں آپ سے پوچھی جائیں ان کا جواب دیجئے۔

میں:۔ جو حکم حاکم۔

راجا۔ لکھنؤ میں کہاں مکان ہے؟

میں:۔ ٹکسال کے پاس۔

راجا۔ جہاں خانم کا مکان ہے وہیں؟

میں:۔ حضور وہیں۔

راجا۔ (آدمیوں کو اشارہ کر کے) دیکھو تخت گھیرے سے ایک بیل گاڑی لے لو۔ لکھنؤ کی رنڈیاں ہیں، ہمارے دیس کی پتریاں نہیں ہیں کہ رات بھر محفل میں ناچیں اور برات کے ساتھ دس دس کوس تک ناچتی چلی جائیں۔

میں:۔ حضور کو خدا سلامت رکھے!

آدمی گئے، گھیرے سے گاڑی لے آئے۔ مجھے گاڑی پر بٹھایا۔ اور لوگ اسی طرح مشکیں کسے ہوئے ساتھ ساتھ تھے۔

گڑھی پہنچ کر وہ لوگ نہیں معلوم کہاں بھیج دیئے گئے، میں کوٹ میں بلائی گئی، ستھرا مکان رہنے کو دیا گیا، دو آدمی خدمت کو مقرر ہوئے۔ پکا پکایا کھانا، پوریاں کچوریاں مٹھائیاں طرح طرح کے اچار

کھانے کو۔ لکھنؤ کے چھوڑنے کے بعد آج رات کو کھانا سیر ہو کر کھایا۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ اور قیدی لکھنؤ روانہ کر دیئے گئے۔ مجھ کو رہائی کا حکم ہے، مگر ابھی راجا صاحب رخصت نہیں کریں گے۔ پہر بھر دن چڑھے راجا صاحب نے بلا بھیجا۔

راجا:۔ اچھا ہم نے تم کو رہا کیا۔ فیضو اور فضل علی دونوں بدمعاش نکل گئے۔ اور سب نابکار جو گرفتار ہوئے لکھنؤ میں پہنچ کر اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ بیشک تمہارا کوئی قصور نہیں، مگر آئندہ ایسے لوگوں سے نہ ملنا، اگر تمہارا جی چاہے دو چار دن یہاں رہو۔ ہم نے تمہارے گانے کی بہت تعریف سنی ہے۔

میں:۔ (نصیبن کی وہ بات یاد آئی کہ راجا صاحب کے پاس لکھنؤ کی کوئی رنڈی ہے۔ ہو نہ ہو اسی نے میری تعریف کی ہوگی) حضور نے کس سے سنا؟

راجا:۔ اچھا یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد لکھنؤ کی وہ رنڈی طلب ہوئی۔ لکھنؤ کی وہ رنڈی کون؟ خورشید جان۔ خورشید دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ دونوں مل کے رونے لگیں۔ آخر راجا صاحب کے خوف سے فوراً علیحدہ ہو کر سامنے مودب بیٹھ گئیں۔ سازندے طلب ہوئے۔

رہائی کی خبر سن کے میں نے ایک حسب حال غزل کہہ لی تھی۔ بہت سے شعر تھے۔ جو شعر یاد آتے ہیں سنائے دیتی ہوں۔ ہر ایک شعر پر راجا صاحب اور حاضرین جلسہ بہت ہی محظوظ ہوئے۔ بے خودی کا عالم طاری تھا۔ غزل یہ ہے:۔

قیدی الفت صیاد رہا ہوتے ہیں
خوش نوایاں چمن زاد رہا ہوتے ہیں
تو بھی چھوڑے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو
کوئی ہم اے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں
حسرت اے ذوق اسیری کہ خفا ہے صیاد
آج ہم بادل ناشاد رہا ہوتے ہیں
خاطر نازک صیاد کو برداشت نہیں
باعث نالہ و فریاد رہا ہوتے ہیں
غم دنیا نہ سہی، او ہزاروں غم ہیں

قید ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں
کیوں نہ رشک آئے ہمیں تازہ گرفتاروں پر
ہم تو اے لذت بیداد رہا ہوتے ہیں
اے ادا قید محبت سے رہائی معلوم
کب اسیر غم صیاد رہا ہوتے ہیں

مقطع سن کے راجا صاحب نے پوچھا۔ "ادا کس کا تخلص ہے؟"
خورشید نے کہا "خود انہی کی کہی ہوئی ہے۔" راجا اور بھی خوش ہوئے۔

راجا:۔ اگر ایسا جانتے تو ہم آپ کو ہرگز رہا نہ کرتے۔

میں:۔ غزل سے حضور کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اسی کا تو افسوس ہے، مگر اب تو حضور حکم دے چکے اور لونڈی آزاد ہو چکی۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ راجا صاحب اندر رسوئی کھانے چلے گئے، خورشید کی مجھ سے خوب باتیں ہوئیں۔

خورشید:۔ دیکھو بہن! میرا کوئی قصور نہیں۔ خانم صاحب سے اور راجا صاحب سے بہت دنوں سے لاگ ڈانٹ تھی۔ راجا صاحب نے کئی مرتبہ مجھے بلوایا، انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر عیش باغ کے میلے میں ان کے آدمی لگے ہوئے تھے، مجھ کو زبردستی اٹھا لائے۔ جب سے یہیں ہوں، ہر طرح کی میری خاطر ہوتی ہے، سب طرح کا آرام ہے۔

میں:۔ موئے گنواروں میں خوب تمہارا جی لگتا ہے۔

خورشید:۔ یہ بات تو سچ ہے۔ مگر تم میری طبیعت کو جانتی ہو۔ روز ایک نئے شخص کے پاس جانا میرے بالکل خلاف ہے۔ وہاں یہی کرنا پڑتا تھا۔ خانم کو جانتی ہو۔ یہاں صرف راجا صاحب سے سابقہ ہے، اور سب میرے حکم کے تابع ہیں۔ دوسرے یہ میرا وطن ہے۔ یہاں کی ہر چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

میں:۔ تو تمہارا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہیں ہے؟

خورشید:۔ مجھے تو معاف کرو۔ یہاں اچھی طرح ہوں، بلکہ تم بھی یہیں رہو۔

میں:۔ میں یہاں تو نہ رہوں گی، مجبوری کی اور بات ہے۔

خورشید:۔ لکھنؤ جاؤ گی؟

میں:- نہیں۔

خورشید:- پھر کہاں؟

میں:- جہاں خدا لے جائے۔

خورشید:- ابھی کچھ دنوں رہو۔

میں:- ہاں ابھی تو ہوں۔

پندرہ بیس دن تک میں گومتی میں رہی، خورشید سے روزانہ ملتی تھی۔ خورشید کا دل وہاں لگا ہوا تھا۔ میرا جی بہت گھبراتا تھا۔ آخر راجا صاحب سے میں نے عرض کیا۔

میں:- حضور نے مجھے حکم رہائی دیا ہے؟

راجا:- ہاں! تو پھر کیا جانا چاہتی ہو؟

میں:- جی ہاں! اب لونڈی کو رخصت کیجیے، پھر حاضر ہوں گی۔

راجا:- یہ لکھنوی فقرے ہیں۔ اچھا کہاں جاؤ گی؟

میں:- کانپور۔

راجا:- لکھنؤ نہ جاؤ گی؟

میں:- حضور! لکھنؤ کیا منہ لے کے جاؤں گی۔ خانم سے کیسی شرمندگی ہو گی، ساتھ والیاں کیا کیا ہنسیں گی۔

اول تو میرا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہ تھا، دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ جانے کو اگر راجا صاحب سے کہوں گی تو شاید رہائی نہ ہو گی، کیونکہ وہاں جانے سے خورشید کا حال کھل جاتا۔ شاید خانم کوئی آفت برپا کرتیں۔

راجا صاحب میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے۔

راجا:- تو لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی؟

میں:- لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا ہے۔ گانے بجانے کا پیشہ ہے۔ جہاں رہوں گی، کوئی نہ کوئی قدردان نکل ہی آئے گا۔ خانم کی قید میں رہنا اب مجھے منظور نہیں۔ اگر وہاں رہنا ہوتا تو نکل کیوں آتی؟

میں نے راجا صاحب کو یقین دلا دیا کہ میں لکھنؤ ہرگز نہ جاؤں گی۔

دوسرے دن راجا نے مجھے رخصت کیا۔ دس اشرفیاں انعام دیں، ایک دو شالہ دیا، ایک رومال،

ایک رتھ مع تین بیل غرضیکہ انہوں نے مجھے ڈیرہ دار پتریا بنا دیا۔ ایک گاڑی بان اور دو آدمی میرے ساتھ کئے۔ اناؤ کو روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر سلارو بھٹیارے کے مکان میں ٹھہری۔ راجا صاحب کے آدمیوں کو رخصت کیا، صرف گاڑی بان رہ گیا۔

سرِ شام میں اپنی کوٹھری کے سامنے بیٹھی ہوں۔ مسافر آتے جاتے ہیں۔ بھٹیاریاں چلا رہی ہیں "میاں مسافر! ادھر ادھر۔ مکان جھاڑا ہوا ہے، حقہ پانی کو آرام، کھانے پینے کو آرام، گھوڑے ٹٹو کے لئے نیم کا سایہ ....."

اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ فیض علی کا سائیں چلا آتا ہے۔ سرا کے پھاٹک ہی سے اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، میری اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا۔ باتیں کرنے لگا۔ پہلے میرا حال پوچھا اس کے بعد میں نے فیض علی کا حال پوچھا۔ اس نے کہا "ان کو آپ کے اناؤ آنے کی خبر مل گئی ہے، آج رات کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے ضرور آجاویں گے۔"

یہ سن کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا۔ تخت کمیرے کے واقعے کے بعد میں سمجھتی تھی کہ اب گلو خلاصی ہو گئی ہے۔ اناؤ میں فیض علی کے ملنے کا مان گمان تک نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا لو پھر آفت کا سامنا ہوا، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ فیض علی میری جان نہ چھوڑیں گے۔ رات کوئی ڈیڑھ پہر رات گئے فیض علی جان پر نازل ہو گئے۔ معمولی بات چیت کے بعد اناؤ سے روانگی کا مشورہ ہونے لگا۔ بڑی دیر تک باتیں رہیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ گاڑی بان کو رخصت کرو۔ سائیں گاڑی ہنکائے گا۔ میں خود گھوڑے کو دیکھ لوں گا۔ پھر یہ ٹھہری کہ گاڑی سلارو بھٹیارے کے پاس چھوڑ دو، راتوں رات گنگا کے اس پار اتر چلو۔ اب کیا کر سکتی تھی۔ فیض علی کے بس میں تھی۔ جو انہوں نے کہا چار و ناچار منظور کرنا پڑا۔ فیض علی نے سلارو کو بلایا، کنارے لے جا کے دیر تک باتیں کیں۔ کوئی آدھی رات گئے اپنے ساتھ مجھے گھوڑے پر بٹھایا، سرائے سے باہر ہوئے۔ پانچ چھ کوس زمین کا چلنا، رات کا وقت، میرا بند بند ٹوٹ گیا۔ مدتوں درد رہا۔ آخر جوں توں کر کے گنگا کے کنارے پہنچے۔ بڑی مشکل سے ناؤ تلاش کی، اس پار اترے، فیض علی نے کہا "اب کوئی خوف نہیں ہے۔" صبح ہوتے ہوتے کانپور پہنچ گئے۔ فیض علی نے مجھ کو لاٹھی محال کی سرائے میں اتارا، خود مکان کی تلاش میں نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آ کے کہا۔ "یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے، مکان ہم نے ٹھہرا لیا ہے، وہاں چلی چلو۔" ڈولی کرایہ پر کی۔ تھوڑی دیر میں ڈولی ایک پختہ عالی شان مکان کے دروازے پر ٹھہری۔ فیض علی نے ہم کو یہاں اتارا۔ مکان کے اندر جا کے کیا دیکھتی

ہوں کہ ایک دالان میں دو کھری چارپائیاں پڑی ہیں۔ ایک چٹائی بچھی ہوئی ہے، اس پر ایک عجیب قطع کا حقہ رکھا ہوا ہے، جسے دیکھتے ہی پینے سے مجھے نفرت ہو گئی۔ مکان کا قرینہ دیکھ کے دل کو وحشت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیض علی نے کہا "اچھا تو میں بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤں۔" میں نے کہا "بہتر، مگر ذرا جلدی آنا۔" فیض علی بازار کو گئے، میں اسی مکان میں اکیلی بیٹھی ہوں۔

اب سنئے، فیض علی بازار کو گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ نہ آج آتے ہیں نہ کل۔ ایک گھڑی، دو گھڑی، پہر، دو پہر، کہاں تک کہوں۔ دوپہر گزری، شام ہونے کو آئی۔ اللہ میں سرِ شام کھانا کھایا تھا رات کو گھوڑے پر چلنے کی تکان، نیند کا خمار، صبح سے منہ پر چلو پانی تک نہیں پڑا، ٹکڑا تک نہیں کھایا، بھوک کے مارے دم نکلا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا، اندھیرا ہونے لگا۔ آخر رات ہو گئی۔ یا خدا اب کیا کروں۔ منہ کھول دیا، اٹھ بیٹھی۔ اتنا بڑا ڈھنڈار مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ہیہات، خدا کی ذات اور میں اکیلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا اب اس کوٹھری سے کوئی نکلا، وہ سامنے والے دالان میں کوئی ٹہل رہا ہے۔ کوٹھے سے دھم دھم کی آواز آئی، زینے سے کوئی کھٹ کھٹ اترا چلا آتا ہے۔ دوپہر رات ہو گئی۔ اب تک انگنائی اور دیواروں پر چاندنی تھی، اب چاند بھی چھپ گیا، بالکل اندھیرا گھپ ہو گیا۔ آخر میں دوشالے سے منہ لپیٹ کے پڑ رہی۔ پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ رات پہاڑ ہو گئی۔ کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ آخر جوں توں کر کے صبح ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو تو عجب ہی عالم تھا۔ اب لکھنؤ کی قدر ہوئی۔ دل میں کہتی تھی یا خدا کس مصیبت میں جان پڑی، لکھنؤ کا عیش چین اور اپنا کمرا یاد آتا تھا ادھر ایک آواز دی ادھر آدمی مستعد۔ حقہ، پان، کھانا، پانی، جو کچھ ہو ادھر منہ کیا ادھر سامنے موجود۔ خلاصہ یہ کہ آج بھی صبح سے دوپہر ہو گئی اور فیض علی نہ آئے۔ اس حالت میں اگر کوئی نیک بخت بی بی چار دیواری کی بیٹھنے والی ہوتی تو ضرور گھٹ گھٹ کے مر جاتی۔ میرا ہواؤ تو کھلا ہوا نہ تھا۔ مگر پھر بھی سینکڑوں مردوں میں بیٹھ چکی تھی۔ کانپور نہ سہی لکھنؤ کے اکثر گلی کوچوں سے واقف۔ یہاں کی بھی سرا دیکھی تھی، بازار دیکھا تھا۔ اب میری بلا اس خالی مکان میں بیٹھی رہتی۔ جھپ سے کنڈی کھول گلی میں نکل کھڑی ہوئی۔ گھر سے دس بیس قدم گئی ہوں گی کہ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک شخص سرکاری وردی پہنے، گھوڑے پر سوار، دس پندرہ برق انداز ساتھ، ان کے حلقے میں میاں فیض علی ہتھکڑیاں کسی ہوئیں، سامنے سے چلے آتے ہیں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی میں سن سے ہو گئی، وہیں ٹھٹک گئی، ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا۔ خیریت یہ

ہوئی کہ ان لوگوں میں سے کسی کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی۔ وہ نکلے ہوئے چلے گئے۔ میں ایک گلی میں ہو رہی۔ تھوڑی دور جا کے ایک پتلی سی گلی ملی۔ اسی گلی میں ایک مسجد تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ سب سے بہتر خدا کا گھر ہے، تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہیئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، میں درانا اندر چلی گئی۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے۔ سر منڈا ہوا تھا۔ ایک نیلی تہمد باندھے دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ پہلے تو شاید سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں، بہت ہی خوش ہوئے۔ جب میں جا کے چپکے صحن کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آ کے پوچھنے لگے "کیوں بی صاحب! آپ کا یہاں کیا کام ہے؟"

میں:۔ میں مسافر ہوں، خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں۔

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ کی نظر اور دل فریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا، ہکا بکا ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ دام میں آ گئے۔

مولوی:۔ (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں:۔ جی کہیں سے آنا ہوا، مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی:۔ (بہت ہی گھبرا کے) مسجد میں؟

میں:۔ جی نہیں، بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی:۔ لاحول ولا قوۃ!

میں:۔ اوئی مولوی صاحب! مجھے تو آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی:۔ جی ہاں، تو میں اکیلا تو رہتا ہوں، اسی لئے تو میں نے کہا مسجد میں آپ کا کیا کام ہے۔

میں:۔ یہ کیا..... خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا۔ مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں، یہ خوب کہی! آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی:۔ میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں:۔ میں آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی:۔ لاحول ولا قوۃ۔

میں:۔ لاحول ولا قوۃ؟ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پڑا ہے؟

مولوی:۔ شیطان آدمی کا دشمن ہے، اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیئے۔

میں:- خدا سے ڈرنا چاہیے، موئے شیطان سے کیا ڈرنا۔ اور یہ کیا آپ نے کہا آپ آدمی ہیں؟

مولوی:- (ذرا بگڑ کے) جی ہاں اور کون ہیں؟

میں:- مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔ اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا؟

مولوی:- پھر کیا کریں، ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں:- اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برستی ہے۔ وہ آپ نے نہیں سنا۔

تنہا نشیں کہ نیم دیوانگی است

مولوی:- اجی وہ کچھ سہی۔ جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں، آپ اپنا مطلب کہئے؟

میں:- مطلب تو کتاب کے دیکھنے سے حل ہو گا بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی:- چہ خوش!

میں:- چرا باشد۔

میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی، مگر اس وقت بھوک کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

رسوا:- یہ مولوی صاحب سے اس قدر مذاق کی کیا ضرورت تھی؟

امراؤ:- اے ہے اس کا حال نہ پوچھو۔ بعض آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

رسوا:- جی ہاں، جیسے کسی کی منڈی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر بعض آدمیوں کی ہتھیلی کھجلاتی ہے، چپت لگانے کو جی چاہتا ہے۔

امراؤ:- بس یہی سمجھ لیجئے۔

رسوا:- اچھا تو وہ مولوی صاحب میں ایسی کون سی بات تھی جس سے مذاق کرنے کو جی چاہتا تھا؟

امراؤ:- کیا کہوں، کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جوان آدمی تھے، صورت بھی کچھ بری نہ تھی۔ سانولی رنگت تھی، چہرے پر رونق پن تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے، منہ پر داڑھی تھی، مگر کچھ بے تکے پن کی حد سے بڑھی ہوئی۔ مونچھوں کا بالکل صفایا تھا۔ تہمد بہت اونچی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر چھینٹ کی بڑی سی ٹوپی تھی جو سر کی پوری چوندی ڈھانکے ہوئے

تھی۔ بات کرنے کا عجیب انداز تھا۔ منہ جلدی سے کھلتا تھا پھر بند ہو جاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجیب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نکہ دار داڑھی کچھ عجب انداز سے بل جاتی تھی۔ اس کے بعد ناک سے کچھ ہونہہ سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں، اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ احتیاطاً منہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے۔

رسوا:- کیا واقعی کچھ کھا رہے تھے؟

امراؤ:- جی نہیں، جگالی کر رہے تھے۔

رسوا:- اکثر کٹ ملا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں جسے دیکھ کے بے وقوفوں کو ڈر لگتا ہے اور عقل مندوں کو ہنسی آتی ہے۔ مجھے ایسی صورتیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔

امراؤ:- اور سنیئے۔ آپ کی گفتگو میں ایک وصف اور بھی تھا، وہ یہ کہ اکثر منہ پھیر لیا کرتے تھے۔

رسوا:- یہ تو عین تمیزداری ہے، اس لئے کہ عندالتقریر آپ کے منہ سے تھوک اڑتا ہو گا۔

امراؤ:- کچھ اور بھی عرض کروں؟

رسوا:- بس اب معاف کیجئے، یہاں تو صبح ہو گئی۔

امراؤ:- القصہ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا۔

مولوی:- (یہ سمجھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے، جلدی سے ہاتھ تو بڑھا دیا اور منہ سے) "اس کی کیا ضرورت تھی۔"

میں:- (مسکرا کے) اس کی اشد ضرورت تھی، اس لئے کہ مجھے بھوک لگی ہے، کسی سے کچھ کھانے کو منگا دیجئے؟

مولوی:- (اب جھینپ تو یوں باتیں بنانے لگے) میں سمجھا۔ (میں نے دل میں کہا سمجھے کیا خاک۔ سمجھتے تو پتھر کے ہو جاتے) اسی لئے تو کہتا ہوں اس کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کھانا یہاں ممکن نہیں ہے؟

میں:- امکان بالقوہ یا بالفعل، بالذات یا بالغیر؟

مولوی:- بالفعل تو ممکن نہیں۔ میرا ایک شاگرد کھانا لاتا ہو گا، آپ بھی کھا لیجئے گا۔

میں:- بالفعل تو ممکن نہیں، بالذات کی آپ کو توفیق نہیں، اور یہاں ضرورت نے اکل

میت کو جواز کا حکم دے دیا ہے، لہٰذا بازار سے کچھ لا دیجئے۔

مولوی۔ اب ذرا صبر کیجئے۔ کھانا آتا ہی ہو گا۔

میں۔ اب صبر کرنا تکلیف مالایطاق ہے۔ اور دوسرے میں نے بالتحقیق سنا ہے کہ رمضان شریف ایک مہینے تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں اور گیارہ مہینے اسی مسجد میں معتکف رہتے ہیں۔

مولوی۔ اس وقت تو فی نفس الامر میں کچھ نہیں ہے مگر میرا ایک شاگرد کھانا لے کے آتا ہو گا۔

میں۔ اور بفرض والتسلیم لو کان حالا اگر کھانا آیا بھی تو وہ آپ کی قوت لایموت کے لئے بھی کافی نہ ہو گا، میری شرکت اس میں یعنی چہ؟ اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار اشد من الموت کا مضمون ہے۔ تا تریاق از عراق آوردہ شود...... ۔

مولوی۔ آہا، آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔

میں۔ مگر میرے زعم ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔

مولوی۔ واقعی ایسا ہی ہے، مگر...... ۔

میں۔ (بات کاٹ کر) مگر اس لئے کہ یہاں تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ لاطائل تقریریں کر رہے ہیں۔

مولوی۔ اچھا تو میں ابھی لایا۔

میں۔ للہ ذرا جلدی لائیے۔

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے اور کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد چار خمیری روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا نیلا شوربا لا کے میرے سامنے رکھ دیا۔ دیکھ کے جان جل گئی۔ مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب اپنے دل میں کچھ اور ہی سمجھے۔

مولوی۔ (فوراً ساڑھے چودہ گنڈے پیسے، کوئی دھیلے کی کوڑیاں چادر کے کونے سے کھول کر سامنے رکھ دیئے) سنئے صاحب! چار پیسے کی روٹیاں ہیں، پیسے کا سالن ہے، دھیلا بھانج (روپے کا خوردہ) میں گیا، آپ کی جمع آپ کے سامنے موجود ہے۔ پہلے گن لیجئے تو کھا لیجئے گا۔

میں نے پھر ایک دفعہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی مگر بھوک بری بلا ہے، جلدی جلدی نوالے اٹھانا شروع کئے۔ جب دو چار نوالے کھا چکی تو مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہوئی۔

میں۔ میں نے کہا مولوی صاحب! کیا اس اجڑے شہر میں یہی کھانے کو ملتا ہے؟

مولوی۔ تو کیا یہاں لکھنؤ کی طرح محمود کی دکان ہے جہاں پلاؤ زردہ آٹھ پہر تیار رہتا ہے؟

میں۔ حلوائی کی دوکان تو ہو گی؟

مولوی۔ حلوائی کی دکان یہ مسجد کے نیچے ہے۔

میں۔ تو پھر چار کوس جانا کیا ضرور تھا۔ دوپہر کے بعد آئے اور لے کے کیا آئے۔ موئے کتوں کا راتب۔

مولوی۔ ایسا تو نہ کہئے۔ آدمی کھاتے ہیں۔

میں۔ آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گے۔ باسی خمیری روٹیاں اور نیلا نیلا شوربا!

مولوی۔ نیلا تو نہیں ہے۔ اچھا تو دہی لا دوں؟

میں۔ جی نہیں رہنے دیجئے، معاف کیجئے۔

مولوی۔ پیسے کا خیال نہ کیجئے، میں اپنے پاس سے لائے دیتا ہوں۔

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ مولوی صاحب مسجد سے باہر چلے گئے۔ اور ایک آب خورے میں خدا جانے کب کا سڑا ہوا کھٹا دہی اٹھا لائے اور اس طرح سامنے لا کے رکھ دیا گویا آپ نے حاتم کی قبر پر لات مار دی۔

بہر طور میں نے وہ چار روٹیاں اگل نگل کے کھائیں اور کوئی بدھنی بھر کے پانی پیا۔ وہ شوربا اور دہی یوں ہی چھوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیسے کوڑیاں بھی وہیں پڑے رہنے دیئے۔

میں ہاتھ دھونے کو اٹھی تھی، مولوی صاحب سمجھے مسجد سے روانہ ہوتی ہے۔

مولوی۔ اور یہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجئے۔

میں۔ میری طرف سے مسجد میں چراغی چڑھا دیجئے۔

منہ ہاتھ دھو کے اپنی جگہ پر آ بیٹھی، مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگی۔

کان پور میں مولوی صاحب کی ذات سے مجھے بہت آرام ملا۔ انہی کی معرفت ایک کمرا کرائے پر لیا۔ نوازی پلنگ، دری، چاندنی، چھت، پردے، تانبے کے برتن اور سب ضروریات کا سامان خرید لیا۔ ایک ماما کھانے پکانے کو اور ایک اوپر کے کام کاج کو، دو اور خدمت گار نوکر رکھ لئے، ٹھاٹھ سے رہنے لگی۔ اب سازندوں کی تلاش ہوئی۔ یوں تو بہت سے آئے مگر کسی کا باج، پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ

کا ایک طبلیہ مل گیا۔ یہ خلیفہ جی کے خاندان کا شاگرد تھا۔ اس سے خوب پرگت ملی۔ اسی کی معرفت دو سارنگئے کان پور کے ذرا سمجھ دار تھے، بلوائے۔ طائفہ درست ہو گیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے تک کمرے پر گانے بجانے کا چرچا رہنے لگا۔ شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ لکھنؤ سے کوئی رنڈی آئی ہے۔ اکثر مرد آدمی آنے لگے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی کم بخت ہو گا جو کسی جلسے میں جانا نہ ہوتا ہو۔ مجرے کثرت سے آتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سا روپیہ کمایا۔ اگرچہ کان پور کے لوگوں کا راہ رویہ بول چال مجھے پسند نہ تھی، بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا، مگر خود مختاری کی زندگی میں کچھ ایسا مزا ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤں گی تو پھر خانم کی نوچی بن کے رہنا پڑے گا، کیوں کہ اس پیشے میں رہ کر لکھنؤ میں خانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ تمام رنڈیاں خانم کا دباؤ مانتی تھیں۔ اگر میں الگ ہو کے رہتی تو کوئی مجھ سے نہیں ملتی۔ دوسرے عمدہ سازندوں کا بہم پہنچنا دشوار تھا۔ ناچ مجرے کا ڈھچر کیوں کر چل سکتا تھا۔ جن سرکاروں میں میری رسائی ہوئی تھی وہ بھی خانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار اچھے گانے والیوں میں تھا، مگر لکھنؤ میں اس کام کے کرنے والے بہت سے ہیں۔ اچھے برے کا امتیاز خاص لوگوں کو ہوتا ہے، عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ اکثر اونچے ہی کمروں پر جاتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کان پور میں میرے حوصلے سے زیادہ میری قدر دانی ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے ہاں کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی، جس میں میرا بلانا باعث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جا کر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ کیا چیز ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شارق لکھنوی بہت مشہور ہیں۔ استاد مسلم الثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ سینکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا ہو گا۔ ایک دن کا تذکرہ سنئے۔ ایک صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں شعر و شاعری کا کچھ چرچا نکلا۔ چھوٹتے ہی انہوں نے پوچھا "آپ حضرت شارق لکھنوی کو جانتی ہیں؟" میں نے کہا "نہیں۔ کون حضرت شارق"؟ یہ صاحب ان کے شاگردوں میں تھے، فوراً بگڑ گئے۔

وہ صاحب:۔ میں تو سنتا تھا، آپ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں؟

میں:۔ جی ہاں غریب خانہ تو لکھنؤ ہی میں ہے۔

وہ صاحب:۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ لکھنؤ میں ہوں اور حضرت استاد کو نہ جانیں۔

میں:۔ لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں کون ایسا ہے، جس کو میں نہ جانتی ہوں۔ استادوں کا تو ذکر

ہی کیا ہے، ان کے نام بر آوردہ شاگردوں میں سے بھی کوئی کم ایسا ہو گا جس کا کلام میں نے نہ سنا ہو۔ ان کے نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ یہ تخلص تو میں نے کبھی سنا نہیں۔

وہ صاحب:۔ (چیں بہ جبیں ہو کے) نام لینے سے کیا فائدہ! تخلص شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک زبان زد خلائق ہیں۔ ہاں اک آپ نہیں جانتیں، نہ جانیں!

میں:۔ حضور معاف کیجئے گا، میرے نزدیک تو یہ شاعرانہ تعلی ہے۔ مگر آپ کے استاد ہیں، آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیے۔ اچھا تو نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ ممکن ہے کہ میں نے تخلص نہ سنا ہو، نام سے واقف ہوں۔

وہ صاحب:۔ میر ہاشم علی صاحب شارق۔

میں:۔ اس نام سے تو بے شک کان آشنا ہیں۔ (اتنا کہہ کے اب میں فکر کرنے میں لگی۔ یا الٰہی یہ کون میر ہاشم علی صاحب ہیں۔ آخر ایک صاحب پر اشتباہ ہوا) آپ کے استاد مرثیہ خوانی بھی تو کرتے ہیں؟

وہ صاحب:۔ جی ہاں، مرثیہ خوانی میں بھی ان کا مثل و نظیر نہیں۔

میں:۔ بجا ارشاد ہوا، یعنی میر صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

وہ صاحب:۔ انہی صاحبوں کے ہمسر ہیں۔

میں:۔ بھلا کس کا مرثیہ پڑھتے ہیں؟

وہ صاحب:۔ کسی کا مرثیہ کیوں پڑھنے لگے، خود تصنیف فرماتے ہیں۔ ابھی ستائیسویں رجب کو نیا مرثیہ پڑھا تھا، تمام شہر میں شہرہ ہے۔

میں:۔ مطلع تو آپ کو یاد ہو گا؟

وہ صاحب:۔ مطلع تو نہیں، تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا، وہ مجھے کیا تمام شہر کی زبان پر ہے۔ قلم توڑ دیا ہے۔

میں:۔ ذرا ارشاد کیجئے گا، میں بھی مستفید ہوں۔

وہ صاحب:۔ نکلی غلاف نور سے تفسیر جوہری۔

میں:۔ سبحان اللہ! اس بند کے تو دور دور شہرے ہیں۔ پانچ مصرعے مجھ سے سن لیجئے، واقعی کیا کلام ہے!

وہ صاحب:۔ (بہت ہی خوش ہو کے) جی ہاں، آپ نے یہ مرثیہ لکھنؤ میں سنا ہو گا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ لکھنؤ کی رہنے والی اور پھر شعر و سخن کا شوق، حضرت شارق کو نہ جانتی ہوں۔

تعجب ہے۔ اب میں سمجھا یہ مذاق تھا۔

میرے جی میں آیا کہہ دوں کہ آپ کے استاد مر کے بھی جئیں گے تو ایسا بند نہیں کہہ سکتے۔ مرزا دبیر (مرحوم) کا کلام ہے، مگر پھر کچھ سمجھ کے چپ ہو رہی۔

رسوا۔ واقعی آپ نے بڑی عقل مندی کی، ورنہ بے چارے کی روزی میں خلل آتا۔ میر ہاشم علی صاحب شارق پر کیا موقوف ہے، اکثر صاحبوں کا یہی شعار ہے۔ دوسروں کا کلام باہر جا کے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ چند ہی روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب میرے ایک دوست کی غزلوں کے مسودے چرا کے لے گئے، حیدر آباد دکن میں سناتے پھرے۔ بڑے بڑے لوگوں سے داد لی، مگر سمجھنے والے سمجھ گئے۔ لکھنؤ سے خطوط آئے۔ اصل مصنف سے تذکرہ ہوا۔ وہ ہنس کے چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھنؤ کو ایسا بدنام کیا ہے کہ اب لفظ لکھنوی اپنے نام یا تخلص کے ساتھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایسے ایسے بزرگ لکھنوی لکھتے ہیں جن کی ہفتاد پشت دیہات میں گزر گئی، خود لکھنؤ میں چند روز طالب علمی یا اور کسی سلسلے سے آکر رہے، چلئے اچھے خاصے لکھنوی بن گئے۔ اگرچہ یہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں مگر جھوٹ سے کیا فائدہ۔

امراؤ۔ جی ہاں، اکثر صاحب اسی طرح لکھنؤ فروشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں۔ کانپور میں میرا بھی ٹھیک یہی حال تھا۔ اس زمانے میں ریل تو تھی نہیں اور نہ لکھنؤ سے کوئی باہر جاتا تھا بلکہ ہر شہر کے کاملین تلاش معیشت میں یہیں آتے تھے، اپنے کمال کی حسب حیثیت داد پاتے تھے۔ دہلی اجڑ کے لکھنؤ آباد ہوا تھا۔

رسوا۔ فی زمانہ یہی حال دکن کا بھی ہے۔ لکھنؤ اجڑ کے دکن آباد ہوا ہے۔ میں تو گیا نہیں، مگر سنا ہے کہ محلے کے محلے لکھنؤ والوں سے آباد ہیں۔

امراؤ۔ جو صاحب لکھنوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے کہئے پہلے اپنی زبان کی موچ نکالیں۔

رسوا۔ کیا خوب بات کہی ہے! واقعی روزمرہ تو کسی قدر آ بھی جاتا ہے، مگر لہجہ نہیں آتا۔

(2)

اتفاقات زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں، اور پھر کب کے بچھڑے ہوئے؟ وہ جن کے ملنے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنئے۔ کانپور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ حد پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گائی ہوئی غزلیں لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ شام کو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے۔ گرمیوں کے دن ہیں، کوئی دو بجے کا وقت ہو گا۔ میں اپنے پلنگ پر اکیلی لیٹی ہوں۔ ماما باورچی خانے میں خراٹے لے رہی ہے۔ ایک خدمت گار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ خس کی ٹٹیاں خشک ہو گئی ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا ہی چاہتی تھی کہ پانی چھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے نیچے کسی نے آکر پوچھا "لکھنؤ سے جو رنڈی آئی ہے اس کا کمرا یہی ہے؟" درگا بنئے (جس کی دکان نیچے تھی) نے جواب دیا "ہاں یہی ہے۔" پھر دریافت کیا "دروازہ کہاں ہے؟" اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی بی کوئی ستر برس کا سن، گوری سی، منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں، بال جیسے روئی کا گالا، کمر جھکی ہوئی، سفید ململ کا دوپٹہ، تن زیب کا کرتا، نین سکھ کا پائجامہ بڑے بڑے پائنچوں کا پہنے، ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے، انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں، ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئیں۔ ایک کالا سا لڑکا کوئی دس بارہ برس کا ان کے ساتھ تھا۔ وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی۔ لکھنؤ سے تمہی آئی ہو؟

میں۔ جی ہاں۔

اتنا کہہ کے میں پلنگ سے نیچے اتر آئی، پان دان آگے کھسکایا، آدمی کو حقے کے لئے آواز دی۔

بڑی بی۔ ہماری بیگم نے تمہیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے۔ زنانہ جلسہ ہو گا۔ تمہارا مجرا کیا ہے؟

میں۔ بیگم صاحب مجھ کو کیا جانیں؟

بڑی بی۔ اے تمام شہر میں تمہارے گانے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمہارے بلانے کا یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیگم صاحب خود بھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

میں۔ اور آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں؟

بڑی بی۔ تم نے کیوں کر جانا؟

میں۔ کہیں بات چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے۔

بڑی بی۔ ہاں، میں بھی وہیں کی رہنے والی ہوں۔ اچھا تو اپنا مجرا تو بتاؤ، ابھی بہت کام پڑا ہے۔

میں۔ مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں، پچاس روپے لیتی ہوں۔ مگر بیگم صاحب لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور انہوں نے قدر کر کے بلایا ہے، تو ان سے کچھ نہ لوں گی۔

جلسہ کب ہے؟

بڑی بی۔ آج شام کو۔ اچھا تو یہ روپیہ کھڑی کا تو لو۔ باقی وہاں آ کے سمجھ لینا۔

میں۔ (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، مگر اس خیال سے کہ بیگم صاحب برا نہ مانیں روپیہ لئے لیتی ہوں۔ اچھا اب کہئے کہ مکان کہاں ہے؟

بڑی بی۔ مکان تو ذرا دور ہے۔ نواب گنج میں ہے یہ لڑکا سر شام آئے گا اسی کے ساتھ چلی آنا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات تمہارے ملنے والوں میں سے تمہارے ساتھ نہ ہو۔

میں۔ اور سازندے؟

بڑی بی۔ سازندے، خدمت گار، ان کی مناہی نہیں ہے، کوئی اور نہ ہو۔

میں۔ جی نہیں، یہاں میرا کون ایسا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی، خاطر جمع رکھئے۔

اتنے میں خدمت گار نے حقہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی مزے لے لے کے حقہ پینے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھہ چونا لگا کے، ڈلیوں کا چورا ڈبیا میں پڑا ہوا تھا۔ ایک چٹکی اس کی اور الائچی کے دانے پان دان کے ڈھکنوں پر کچل کے گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی۔ ہائے بیٹا! دانت کہاں سے لاؤں جو پان کھاؤں۔

میں۔ آپ کھائیے تو، میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے۔

بڑی بی سمجھ گئیں۔ پان لے کے کھایا، بہت ہی خوش ہوئیں۔ "ہائے ہمارے شہر کی تمیز داری!" اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئیں رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں۔ "ذرا دن سے آ جانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔"

میں۔ اگرچہ مجرے کا یہ دستور نہیں ہے، مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا ہے تو میں سویرے سے حاضر ہو کر مبارک باد گاؤں گی۔

واقعی وطن کی قدر باہر جا کے ہوتی ہے۔ کانپور میں سینکڑوں جگہ مجرے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق تک نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے، خدا خدا کر کے اتنا دن کٹا۔ پانچ بجتے بجتے لڑکا آ موجود ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی بیٹھی تھی، سازندوں کو بلوا رکھا تھا۔ لڑکے نے ان کے مکان کا پتا بتا دیا، میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹے بھر کا راستہ تھا۔ چھ بجے میں وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خار دار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے ایک دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ، کھجور اور طرح طرح کے خوب صورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے۔ روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ تھا۔ جا بجا کھنگروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے ارد گرد دوب جمائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چہار طرف پکے برھے بنے ہوئے تھے ان میں صاف موتی سا پانی بہہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعے سے پانی دے رہے تھے۔ پتیوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جو اب پانی پہنچا تھا کیسے ترو تازہ اور شاداب تھے۔

سالگرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی۔ عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شیام کلیان کی ایک چیز شروع کر دی۔ کوئی سننے والا نہ تھا، آپ ہی آپ گایا کی، پھر چپ ہو رہی، بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپے انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی، چاند نکل آیا، چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے مل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے ایک کنارے پر بہت عالی شان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد ولایتی پھولوں کے ناندے نہایت خوب صورتی سے سجے ہوئے تھے، اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چبوترا تھا۔ اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوا دار چوبی بنگلہ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں پانی نہر سے آ کے گرتا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی۔

واقعی عجیب عالم تھا۔ شام کا سہانا وقت، ستھری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں کی مہک۔ ایسی فضا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چبوترے پر سفید چاندنی کا فرش تھا، مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کوٹھی سے لے کر اس چبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی راہ سے بیگم صاحب تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑی ہوئی تھیں۔ چبوترے پر دو سبز مردنگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کدارے کی ایک چیز شروع کر دی۔ بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لئے ہوئے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دیئے۔ سازندوں سے کہا تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ، وہیں کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہو گا۔ جب وہ لوگ اٹھ گئے، بیگم صاحب برآمد ہوئیں۔ میں تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے مجھ کو قریب بلایا، خود مسند پر بیٹھ گئیں۔ گانے کے لئے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی۔

حیرانی نگاہ تماشا کرے کوئی
صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا مگر اب یقین ہو گیا۔ پری میرے سامنے گاؤ تکئے سے لگی بیٹھی ہے۔ مانگ نکلی ہوئی ہے۔ چوٹی کمر تک پڑی ہوئی، سرخ و سفید رنگت، اونچا ماتھا، کھنچی ہوئی بھویں، بڑی بڑی آنکھیں، گال جیسے گلاب کی پتیاں، لچھوئی ناک، چھوٹا سا دہانا، پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آسکتی ہو۔ اس پر اعضا کا تناسب اور سینے کا ابھار پن کس قدر خوش نما تھا۔ سینکڑوں عورتیں میری نظر سے گزر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت کبھی نہ دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت جھلک ملتی تھی۔ مگر کہاں خورشید کہاں وہ! خورشید کی صورت میں پھر ذومنی پنا تھا۔ اس میں یہ امیرانہ رعب، یہ تمکنت، یہ بھاری بھرکم پن کہاں! دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا کامنی سا نازک نازک چھریرا بدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آٹھ پہر اداسی برستی تھی، جب دیکھو بروگن بنی تھی۔ بیگم صاحب بہت خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بہ خود ہنسے دیتی ہیں مگر کسی کو مجال کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انہی میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ ایسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔

لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین بسنتی دوپٹا کندھوں سے ڈھلکا ہوا، پیکلی کا شلوکا پھنسا پھنسا، سرخ گرنٹ کا پائجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھوں میں موتیوں کی ممریں، بازوؤں پر نورتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں۔ چہرے کی خوب صورتی، لباس کی سادگی، اور زیور کی مناسبت، یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقش حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی۔ میں اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے، وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے، مگر یقین ہی کیجئے گا، ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی، مجھی کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں۔ میرے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ کہوں تو کیوں کر کہوں۔ ایک مہری پس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی ہے، دو سامنے کھڑی ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کی ڈبیا، دوسری کے پاس خاص دان۔ بڑی دیر تک نہ بیگم صاحب نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ میں کچھ بول سکی۔ آخر انہوں نے سلسلہ کلام اس طرح شروع کیا۔

بیگم۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میں۔ (ہاتھ باندھ کے) امراؤ۔

بیگم۔ "خاص لکھنؤ میں مکان ہے۔"

(یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا، خصوصاً اس موقع پر، اس لئے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فوت ہو جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل افشائے راز کا خیال ہے، آخر بہت سوچ سمجھ کے)

میں۔ جی ہاں، پرورش تو لکھنؤ میں پائی ہے۔

جواب دینے کو تو دے دیا، مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائے گا تو پھر وہی دقت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط نہ تھا، اس لئے کہ فوراً ہی بیگم صاحب نے پوچھا۔

بیگم۔ تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے؟

اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا، جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ آخر اس بات کو ٹال کے۔

میں۔ حضور کا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے؟

بیگم۔ کبھی لکھنؤ میں تھا، اب تو کانپور ہی وطن ہو گیا۔

میں:- میرا بھی یہی ارادہ ہے۔

بیگم:- کیوں؟

میں:- (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا۔ کون قصہ بیان کرتا) اب کیا عرض کروں، بیکار سمع خراشی ہوگی۔ حال ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے کہ لکھنؤ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم:- چلو اچھا ہے، تو ہمارے پاس بھی کبھی کبھی چلی آیا کرو۔

میں:- آنا کیسا، میرا تو ابھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اول تو آپ کی قدردانی، دوسرے یہ باغ، یہ فضا، ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو؟ خصوصاً مجھ جیسی خفقانی مزاج کی عورت کے لئے تو یہاں کی آب و ہوا اکسیر کا خواص رکھتی ہے۔

بیگم:- اے ہے! تمہیں یہ جنگلہ بہت پسند آیا۔ نہ آدمی نہ آدم ذات، ہیہات خدا کی ذات، شہر سے کوسوں دور۔ چار پیسوں کا سودا منگاؤ تو آدمی صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ چھائیں پھوئیں، شیطان کے کان بہرے، کوئی بیمار ہو تو جب تک حکیم صاحب شہر سے آئیں، یہاں دشمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔

میں:- حضور اپنی اپنی طبیعت! مجھے تو بہت ہی پسند ہے۔ میں تو جانتی ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔ دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے۔

بیگم:- جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ شہر میں ہزار طرح کا آرام ہے۔ اور سب باتوں کو جانے دو، جب سے نواب کلکتے گئے ہیں، راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔ یوں تو خدا کے دیئے سپاہی، پاسی، خدمت گار اس وقت بھی دس مرد نوکر ہیں۔ عورتوں کی گنتی نہیں۔ مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ میں تو دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں، اگر نواب بھی جم آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہوں گی۔

میں:- قصور معاف ہو، آپ کا مزاج وہمی ہے۔ ایسے ایسے وسواس دل میں نہ لایا کیجئے۔ شہر میں جائیے گا تو قدر عافیت کھلے گی۔ وہ گرمی ہے کہ آدمی پکے جاتے ہیں۔ دوسرے بیماریاں، خدا پناہ میں رکھے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کر آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا، ماشاءاللہ گورا گورا خوبصورت۔ ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا جیسے مینا۔ بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کھلا کدا کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ بڑی دیر تک لئے رہی اور پیار کیا کی، پھر کھلائی کو دے دیا۔

میں:- یوں تو شاید نہ بھی آتی، مگر میاں کو دیکھنے تو ضرور ہی آؤں گی۔

بیگم:- (مسکرا کے) اچھا کسی طرح ہو، آنا ضرور۔

میں:- ضرور ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ بار بار کیوں فرماتی ہیں۔ میں تو اس قدر حاضر ہوں گی کہ حضور کو دوبھر ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف کی۔ اسی اثناء میں خاصہ والی نے آ کے کہا کہ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا چلو کھانا کھا لو۔

میں:- بہت خوب!

بیگم مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں، میں بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہریوں کو اشارہ کیا تم یہیں ٹھہرو۔ ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں:- واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم:- تو کیا کھانا یہیں منگوا لیا جائے؟

میں:- جی نہیں! اچھا، کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔

بیگم:- (ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلوا دیا گیا؟

مہری:- (ہاتھ باندھ کے) حضور! دلوا دیا گیا۔

بیگم:- اچھا انہیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا۔ امراؤ جان کھانا کھا کے جاویں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے۔ ایک مہری آگے آگے فانوس لئے جاتی تھی۔ چپکے سے میرے کان میں کہا "مجھ کو تم سے بہت باتیں کرنا ہیں، مگر آج اس کا موقع نہیں۔ کل تو مجھے فرصت نہ ہوگی، پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا"

میں:- مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

بیگم:- اچھا تو آج کچھ نہ کہو۔ چلو کھانا کھا لیں، اس کے بعد تمہارا گانا سنیں گے۔

میں:- پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔

بیگم۔ ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے۔ اس پر گانا۔

میں۔ بہت خوب!

اب ہم کوٹھی کے زینے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طرح سلیقے سے سجی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمدہ ملا، اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گزرے۔ ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا۔ ہر کمرے کا فرش فروش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا۔ آخر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں دستر خوان چنا ہوا تھا۔ دستر خوان پر دو عورتیں اور منتظر تھیں۔ ان میں سے ایک چٹھی نویس تھی، ایک مصاحب۔ ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا۔

دستر خوان پر کئی قسم کے پلاؤ، بریانی، مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقرخانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربے، مٹھائیاں، دہی، بالائی غرض کہ ہمہ قسم کی نعمت موجود تھی۔ لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔ بیگم ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلایا۔

بیسن دانی اور تسلہ آیا، ہاتھ منہ دھو کے سب نے پان کھائے۔ پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما۔ اس جلسے میں صرف بیگم صاحب ہی نہ تھیں۔ چٹھی نویس، مصاحبین، مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہریاں، مامائیں، سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحب نے حکم دیا کہ طبلے کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب، جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی، طبلہ بجانے لگی، خود بیگم صاحب ستار چھیڑنے لگیں، مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھاتے گیارہ بج چکے تھے۔ جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ، جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل اور پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے، عجب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالی شان کوٹھی کے ایک گوشے سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی۔ سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا عالم تھا۔ مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں

چونک کر ایک بار تک بول دیتا تھا یا شکاری جانوروں کے ہول سے جو چڑیاں اڑتی تھیں اس سے پتے کھڑک جاتے تھے یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی۔ مینڈک اپنا بے تکا راگ گا رہے تھے۔ جھینگر آس دے رہے تھے۔ سوائے اس چبوترے کے، جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ جلسہ جمائے بیٹھی تھیں، اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے۔ صرف دو مرد نگوں کی روشنی تھی، ان کے بھی شیشے سبز۔ تاروں کا عکس تالاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا۔ وقت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے بھیانک سروں نے دلوں پر اپنا اثر کیا تھا۔ سب مبہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی، اور جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اوروں کا کیا ذکر، خود میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل میں کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا، بیشک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اس اثنا میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز آئی، اس نے اور بھی دلوں کو دہلا دیا، اس کے بعد کتے بھونکنے لگے۔ اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اتنے میں بیگم صاحب نے گاؤ تکیے سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں۔ اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں، میں بھی مڑ کے دیکھنے لگی۔

بیگم صاحب کو میں سمجھ چکی تھی کہ وہمی ہیں، مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے وہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منہ پر ڈھاٹے باندھے، ننگی تلواریں ہاتھ میں، دوڑتے چلے آتے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر، خدمت گار، پاسی سب اسی طرف کو چلے۔ کوئی نہتا، کسی کے ہاتھ میں لاٹھی۔ مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے۔ کئی تو راستے ہی سے فرار ہو گئے، چار پانچ آدمی چبوترے تک پہنچ ہی گئے۔ انہوں نے عورتوں کو بیچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہو گئے۔ عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ ایک میں، خدا جانے کیا پتھر دل تھا کہ بیٹھی رہی۔ مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔ یا اللہ! دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے۔ وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامی

ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز۔ (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو، ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں ان لوگوں کا عندیہ معلوم کر لینے دو۔ (ڈاکوؤں سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟

ایک ڈاکو۔ جس ارادے سے آئے ہیں تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

سرفراز۔ وہی میں پوچھتا ہوں، جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟

دوسرا ڈاکو۔ ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی باپ مارے کا بیر ہے؟ ہاں جس ارادے سے آئے ہیں اس میں تم مزاحم ہو گئے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز۔ (کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا بہو بیٹیوں کی آبرو لو گے؟ اگر یہ مقصد ہو..... (سرفراز پوری بات بھی کرنے نہ پایا تھا کہ کسی نے ڈاکوؤں کی طرف سے کہا)

کوئی ڈاکو۔ نا صاحب! کسی کی بہو بیٹیوں سے کیا واسطہ۔ کیا ہمارے بہو بیٹیاں نہیں ہیں؟ عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے؟

سرفراز۔ (خوش ہو کے) تو پھر یہی میں پوچھتا ہوں۔ اچھا تو بھائیو، ہم ابھی تمہیں کمروں کی کنجیاں منگائے دیتے ہیں، اور جو عورتیں وہاں ہیں ان کو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔ گھر کی مالک بیگم یہیں ہیں۔ تم شوق سے کوٹھی میں جاؤ، جو جی چاہے اٹھا لے جاؤ۔ رہا عورتوں کا زیور وہ بھی ہم اتروائے دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائے گا۔ خدا کے حکم سے لاکھوں روپیہ بینک گھر میں جمع ہے۔ علاقے سے جو آتا ہے اس کا ذکر نہیں۔

ڈاکو۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ مگر اس میں دغا نہ ہو۔

سرفراز۔ سپاہی کے پوت دغا نہیں کرتے، خاطر جمع رکھو۔

وہی ڈاکو جس کی آواز میں نے پہچانی تھی، آگے بڑھا۔

ڈاکو۔ واہ کیا کہنا! مردوں کا قول ہی تو ہے۔ اچھا تو کنجیاں؟

اتنا کہنا تھا کہ میری اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے پہچان تو لیا، بولنے کا قصد کیا، مگر دل میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا "بھائی! تم یہاں کہاں؟"

میں۔ جب سے تمہارے بھائی قید ہو گئے یہیں ہوں۔

فضل علی۔ یہاں کس کے پاس؟

میں۔ رہتی تو شہر میں ہوں لیکن یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے پاس نوکر ہیں، ان سے ملنے آئی تھی۔

فضل علی۔ تمہاری بہن کہاں ہیں؟

میں۔ یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا بے چاری غش میں پڑی ہیں۔ میری طرح تو ہیں نہیں، بیچاری پردہ نشیں ہیں؟

فضل علی۔ پردہ نشیں ہیں؟

میں۔ جوانی میں رانڈ ہوئیں، جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہیں۔

فضل علی۔ (اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسے کی چیز لینا میرے نزدیک تو حرام ہے اور نہ میں اس معاملے میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو۔ یہ کیا، پھر آئے کیوں تھے؟

فضل علی۔ جس ارادے سے آئے، تمہیں معلوم ہے، مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں، یا جس سرکار سے ان لوگوں کا توسل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا!

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا، مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے، کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ پھر بھی خالی ہاتھ پھر جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو غل مچاتے تھے "فاقوں مرتے ہیں، کریں تو کیا کریں۔ ایک موقع ملا بھی تو اسے خان صاحب چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں۔"

جب فضل علی اپنے گروہ سے نکل کے الگ کھڑے ہوئے تو ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور شخص سیاہ فام سایہ کہتا ہوا نکلا ۔

وہ شخص۔ کھان صاحب، میں بھی تمرے ساتھ ہوں۔

غور سے جو دیکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیں ہے۔ میں نے اسے بلایا۔ علیحدہ لے جا کے باتیں کیں۔ وہ اشرفی اور روپے جو بیگم صاحب نے انعام دیئے تھے، چپکے سے اسے دے دیئے۔

فضل علی۔ (سرفراز خان سے) بھائی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جانو اور یہ لوگ۔

سرفراز۔ میں ان لوگوں کو بھی راضی کئے دیتا ہوں۔ مگر یہاں سے چلو۔ عورتیں پریشان ہو رہی ہیں۔ ذرا ان کو ہوش میں آنے دو۔ ہم تم لوگوں کو خوش کریں گے۔ ڈاکو وہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحب ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ دانت بیٹھ گئے تھے۔ میں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی، ان کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا "سنبھل کے بیٹھئے، خدا کے صدقے سے وہ آفت ٹل گئی۔ خاطر جمع رکھئے۔" اور عورتوں کو بھی پانی چھڑک کر اٹھایا۔ سب اٹھ کے بیٹھیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحب بہت خوش ہوئیں۔ سرفراز خان کو بلا بھیجا۔

سرفراز۔ سرکار کچھ دے دیجئے، بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نہ امراؤ جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت ٹلتی۔

بیگم۔ کسی نہ کسی وقت کی محبت کام آ ہی جاتی ہے۔

میں نے اس بات کا جواب نہ دیا، اس لئے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت گھبراہٹ میں یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اس موقع پر ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے۔

میں۔ جی نہیں۔ میں نے کیا کیا۔ یہ بھی اتفاق تھا۔

مختصر یہ کہ بیگم نے صندوقچہ منگایا۔ پانچ سو نقد اور پانچ پانچ سو کا سونے چاندی کا زیور دے کے انہیں ٹالا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم۔ کیوں امراؤ جان! باغ میں رہنے کا مزا دیکھا؟

میں۔ حضور سچ کہتی تھیں۔

اب صبح کے تین بج گئے تھے، سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لئے بچھوا دیا گیا۔ نیند کسے آتی۔ رات بھر جاگ رہی۔ صبح ہوتے سب سو گئے۔ میری آنکھ بھی لگ گئی۔ ابھی نیند بھر کے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمت گار سواری لے کے آ گئے۔ مجھے جگوایا، میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدمت گار۔ آپ تو خوب یہاں آئیں، رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کئے۔

میں۔ کیوں کر آتی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدمت گار۔ اچھا تو اب چلئے۔ لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں۔

میں سمجھ گئی۔ ہوں نہ ہوں بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے۔ آخر پتا لگا لیا نا!

میں۔ اچھا چلتی ہوں، سواری لائے ہو؟

خدمت گار۔ حاضر ہے۔

جب میں نے جانے کا قصد کیا دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ مجھ کو روکا کہ بیگم صاحب سے مل کے جایئے گا۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے، بیگم صاحب خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی۔ ایسا ہی ہے تو پھر آؤں گی۔

عورتیں۔ بھلا اب کیا آؤ گی۔

گھر پر جو آ کے دیکھتی ہوں، بوا حسینی اور میاں گوہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے لپٹ گئیں، رونے لگیں، میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی۔ اللہ بیٹی! کیا سخت دل کر لیا۔ تمہیں کسی کی محبت ہی نہیں۔

میں بجائے خود شرمندہ تھی، جواب کیا دیتی، جھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے لاکھ اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ، انہوں نے نہ مانا۔ زیادہ عجلت کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب بیمار تھے، بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی، جو چلی آئی تھیں، وہ دن کانپور سے اسباب وغیرہ کے باندھنے اور مکان کے کرائے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرائے پر لی تھی۔ ضروری اسباب اس پر لاد لیا اور فضول سامان نوکروں کو دیدیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئی۔ پھر وہی آب و دانہ ہے، وہی مکان، وہی کمرا، وہی آدمی۔

دشت جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل
زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

(3)

دیکھئے پہنچے کہاں تک سوزش دل کا اثر
صرصر وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک رہا۔ اسی اثنا میں شہزادے مرزا سکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرائیوں میں میرا بھی اسم ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتے چلے گئے، وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں باغی فوج نے مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا، میں بہ لحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا، مبارک باد دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا کل وہ گرفتار ہوا، پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سماں نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں تھے، ان کا تعین در دولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے، اس لئے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مجرے کے لئے بھی وقت بے وقت طلبی ہو جاتی تھی۔ اب چند روزہ حکومت کے زمانے میں برجیس قدر کے گیارھویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسے میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی۔

غیرت مہتاب ہے برجیس قدر
گوہر نایاب ہے برجیس قدر

میں نے ایک غزل اس موقع کے لئے تصنیف کی تھی، اس کا مطلع یہ ہے۔

دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی
حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

رسوا۔ امراؤ جان! تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے۔ اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو۔

امراؤ۔ گیارہ شعر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم! سوا اس مطلع کے اور کوئی شعر یاد نہیں۔ وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا، نگوڑی دن رات جان دھڑکے میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچے پر لکھ لی تھی۔ جس دن تک بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں، وہ پرچہ میرے پان دان میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا، ہول جول میں پان دان کیسا، جوتیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔

رسوا۔ بھلا کچھ یاد ہے؟ بیگم صاحب کس دن قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امراؤ۔ دن تو یاد نہیں، ہزاری روزے، کے دوسرے یا تیسرے دن۔

رسوا۔ ہاں تمہیں خوب یاد رہا، رجب کی انتیسویں تاریخ تھی۔ بھلا فصل کون سی تھی؟

امراؤ۔ اخیر جاڑے تھے، نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوا۔ بالکل درست۔ مارچ کی سولہویں تاریخ تھی۔ اچھا تو تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں؟

امراؤ۔ جی ہاں، بونڈی تک میں ہمراہ گئی۔ راستے میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ "لو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں۔" دوسرے صاحب فرماتے ہیں "بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا۔" تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے ہیں۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر نہیں ملا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر دھاوا کیا ہے، اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں، میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔

رسوا۔ سنا ہے بونڈی میں چار دن کے لئے خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔

امراؤ۔ آپ نے تو سنا ہے، میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔

رسوا۔ اچھا اس قصے سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کہئے کہ وہ مال جو آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا، اس کا حشر کیا ہوا؟

امراؤ۔ (ایک سرد آہ بھر کے) اے ہے یہ نہ پوچھئے۔

رسوا۔ غدر میں سب لٹ گیا؟

امراؤ۔ غدر میں لٹ جاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔

رسوا۔ پھر کیا ہوا؟

امراؤ۔ سارا قصہ دہرانا پڑا۔ جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی، میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں، اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔ خانم کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے، امام باڑے کے کوٹھے کی دیوار پر چڑھ جاؤ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا تھا۔ میں اکثر چارپائی لگا کے اس دیوار پر چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ زیور کی پٹاری میں نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور ان کے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ اس کو حفاظت سے رکھنا۔ انہوں نے

فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری اسی طرح گودڑ میں لپٹی ہوئی میرے حوالے کر دی۔ غدر میں تمام دنیا کے گھر لٹے۔ اگر کہہ دیتیں کہ لٹ گئی تو میں ان کا کیا کر لیتی، مگر واہ ری بیوی! ایک حبہ تک نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھما ہوا ہے۔ نہیں تو کب کی قیامت آجاتی۔

رسوا۔ بھلا کتنے کا مال ہو گا؟

امراؤ۔ کوئی دس پندرہ ہزار کا مال تھا۔

رسوا۔ اور اب کیا ہوا؟

امراؤ۔ کیا ہوا؟ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔

رسوا۔ مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمہارا ایک حبہ بھی غدر میں نہیں لٹا، سب مال تمہارے پاس ہے۔

امراؤ۔ اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی جیسی اب رہتی ہوں۔

رسوا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنا بھگل نکالا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ اب بھی کچھ برے حالوں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں۔ خوش خوراک خوش پوشاک بھی ہو۔

امراؤ۔ خدا رازق ہے۔ جو جس کا خرچ ہے وہ ضرور اس کو ملتا ہے۔ اس مال کا تو ایک حبہ بھی نہیں رہا۔

رسوا۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟

امراؤ۔ اب کیا بتاؤں، ایک مہربان-----

رسوا۔ میں سمجھ گیا۔ یہ گوہر مرزا کی حرکت ہو گی؟

امراؤ۔ میں اپنے منہ سے نہیں کہتی، شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔

رسوا۔ بیشک تمہارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھئے وہ چین کر رہے ہیں اور تمہیں پوچھتے تک نہیں۔

امراؤ۔ مرزا صاحب! رنڈی سے رسم رہا رہا، نہ رہا نہ رہا۔ اب وہ مجھے کیوں پوچھیں۔

مدت ہوئی کہ ترک ملاقات ہو گئی

رسوا۔ اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟

امراؤ۔ وہ کاہے کو تشریف لائیں گے۔ میں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ان کی بیوی سے محبت ہو گئی ہے۔ ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔

رسوا۔ جب بھی کچھ دے ہی آئی ہو گی؟

امراؤ۔ جی نہیں، میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔

رسوا۔ تو وہ مال گوہر مرزا صاحب کے ہتھے لگا؟

امراؤ۔ مرزا صاحب! مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ہاتھوں کا میل ہے، فقط بات رہ جاتی ہے۔ اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے قربان جاؤں! کبھی تنگی بھوکی نہیں رہتی۔ آپ ایسے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے! مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

رسوا۔ اس میں کیا شک ہے۔ وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اب بھی سو سے اچھی، ہزار سے اچھی۔ واللہ! یہ تمہاری نیت کا ثمرہ ہے۔ خدا نے زیارت سے بھی مشرف کیا۔

امراؤ۔ جی ہاں، مولا نے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمنا ہے۔

پھر مجھے کربلا بلا بھیجیں
میری مٹی عزیز ہو جائے

مرزا صاحب میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی مگر خدا جانے کیا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہو گیا، مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہو گیا، پھر نہ آؤں گی۔

(4)

سن چکے حال تباہی کا مری، اور سنو
اب تمہیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

بونڈی سے بیگم صاحب اور برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرائے میں اتری، پھر ترپولئے کے پاس ایک کمرا کرائے کو لے لیا، میراثی نوکر رکھ لئے، گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہے۔ آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی مجرا آجاتا ہے۔ اس پر بسر ہے۔ تمام شہر میں

میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب وخیال کی طرح بچپن کی باتیں بھی یاد آجاتی ہیں، اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ مگر انتزاع سلطنت، غدر، یہ جیں قدر یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ کلیجا پتھر کا ہوگیا ہے۔ ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو۔ اگر ہو تو اب ان کو مجھ سے کیا مطلب۔ وہ اور عالم میں ہوں گے۔ میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔ گھر کا خیال آتے ہی یہ باتیں دل میں آتی تھیں۔ پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی، مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا دل بھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے، کس کے لئے جاؤں، خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا ان سے اب کیوں کر بنے گی۔ وہ وہی اگلی حکومت جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنؤ لٹ گیا میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہوگا۔ اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اور اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے، میرے ہاتھ گلے میں جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے۔

ایک دن کمرے میں بیٹھی ہوں۔ ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کر دیا، حقہ بھروا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا، ہو بیگم صاحب کے عزیزوں سے ہیں، وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں مقبرے کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں: اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے؟

نواب صاحب: اکثر مر گئے، نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا، بالکل نیا انتظام ہے۔

میں: اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب: ہاں تھے، مگر تم کیا جانو؟

میں: غدر سے پہلے میں ایک محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انہوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب: وہی جمعدار نا! جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی؟

میں: مجھے کیا معلوم؟ (دل میں، ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے!)۔

نواب: یوں تو کئی جمعدار تھے، اور اب بھی ہیں، مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں: ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب: تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟

میں: اسی دن ان کے ساتھ تھا۔ ایسی بھی شکل ملتے کم دیکھی ہے۔ بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب: جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات ٹالنے کے لئے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی، میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آگئی تھی، گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کر مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا، اس کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں کا مجرا آیا تھا، وہاں گئی۔ محلے کا نام یاد نہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت پرانا املی کا درخت تھا، اسی کے نیچے نمگیرہ تانا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھیں۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بجے شروع ہوا، بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل امنڈا چلا آتا تھا۔ صاف یہی جی میں آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے۔ ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لئے میں قناتوں سے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہوگیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں، ماں کے قدموں پر گر پڑوں، وہ گلے لگا لیں گی۔ مگر جرات نہ ہوتی تھی، اس لئے کہ میں جانتی ہوں دیہات میں رنڈیوں سے بہت ہی پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے! صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر

میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری ہے!

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آکے پوچھا "تمہی لکھنؤ سے آئی ہو؟"

میں۔ ہاں (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)۔

عورت۔ اچھا تو ادھر چلی آؤ، تمہیں کوئی بلاتا ہے۔

میں اچھا کہہ کر اس کے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی اور پڑتا کہیں تھا۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی ڈیوڑھی میں ایک چارپائی پر مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دو تین عورتیں آکر کھڑی ہوئیں۔

ایک۔ لکھنؤ سے تمہی آئی ہو؟

میں۔ جی ہاں۔

دوسری۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میں۔ (جی میں تو آیا کہہ دوں امیرن، مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

پہلی۔ تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟

میں۔ (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے، جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی۔ تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں۔ (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے، بہ مشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری۔ کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں۔ ذات کی پتریا تو نہیں ہوں، تقدیر کا لکھا پورا کر رہی ہوں۔

پہلی۔ (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو؟ آخر کہو پھر تم کون ہو؟

میں۔ (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں۔ اب بالکل تاب ضبط نہ تھی، سینے میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں۔ ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ اس نے میرے منہ کو

ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور یہ کہہ کر دوسری کو دکھایا "کیوں، ہم نہ کہتے تھے وہی ہے؟"

دوسری "ہائے میری امیرن" کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آکر چھڑایا۔

اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا۔ میری ماں بیٹھی سنا کی اور رویا کی۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھی رہیں۔ صبح ہوتے میں رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی، مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آکے کل روپیہ مجرے کا واپس دے دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولہا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن، دن بھر میرا جو حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پلنگ پر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو کوئی آدھی رات گئے ایک جوان سا آدمی، سانولی رنگت، کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے میں آیا۔ میں نے حقہ بھروا دیا۔ پان دان میں پان نہ تھے، ماما کو بلا کے چپکے سے کہا پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان۔ کل تمہی مجرے کو گئی تھیں؟ (یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی)۔

میں۔ ہاں۔

اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان۔ (سر نیچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا!

میں۔ (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان۔ ہم سمجھے تھے کہ تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو۔

میں۔ بے غیرت زندگی تھی، نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے!

جوان۔ بیشک۔ اس زندگی سے موت لاکھ درجے بہتر تھی۔ تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا یا کچھ کھا کے سو رہی ہوتیں۔

میں۔ خود اتنی سمجھ نہ تھی اور نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی، اب سہی۔

جوان:- اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں۔ اور آئی بھی تھیں تو اس محلے میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں:- ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی، مگر مجھے کیا معلوم تھا۔

جوان:- اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

میں:- اب کیا ہوتا ہے۔

جوان:- (بہت ہی غصہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے! اب (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا۔ دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے۔ اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے۔ "ارے دوڑو، بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔"

جوان:- (چھری گلے سے ہٹا کے، ہاتھ چھوڑ دیئے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی ۔۔۔۔۔۔ اتنا کہہ کے دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

میں پہلے ہی رو رہی تھی۔ جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی، جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجے پر پہنچا تھا، اس سے دم بخود سی ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا، میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا، کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارے سے منع کیا۔ ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

جب دونوں خوب رو دھو چکے۔

جوان:- (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں:- کل چلی جاؤں گی، مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان:- بس اب دل سے دور رکھو، معاف کرو۔ کل اماں نے تمہیں گھر پر بلا لیا، میں نہ ہوا! نہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا۔ محلے بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں:- تم نے دیکھ لیا، جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہائے تمہاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو! خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان:- برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں:- اچھا۔

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا۔ میں اپنے غم میں مبتلا تھی، ماما نے اور جان کھانا شروع کی۔

"یہ کون تھے؟"

میں:- رنڈی کے مکان پر ہزار آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے، تمہیں کیا؟

بہر طور ماما کو ٹال دیا۔ رات کی رات سو رہی، صبح کو اٹھ کے لکھنؤ چلنے کی تیاری کی، شاموں شام شکرم کرائے کر کے روانہ ہو گئی۔

حصہ سوم

(1)

نہ پوچھو ہم سے کیونکر زندگی کے دن گزرتے ہیں

لکھنؤ میں آکر خانم کے مکان پر اتری۔ وہی چوک، وہی کمرا، وہی ہم ہیں۔ اگلے آنے والوں میں سے کچھ لوگ کلکتے چلے گئے تھے، کچھ اور شہروں میں نکل گئے تھے۔ شہر میں نیا انتظام، نئے قانون جاری تھے۔ آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا۔ چاروں طرف دھس بنے ہوئے تھے۔ گول دروازے سے لے کر دریا تک دور دور مکان کھدے ہوئے پڑے تھے۔ جابجا چوڑی چوڑی سڑکیں نکل رہی تھیں۔ گلیوں میں کھرنجے بنائے جاتے تھے۔ نالے نالیاں صاف کی جاتی تھیں۔ غرضیکہ لکھنؤ اب اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

دوچار مہینے خانم کے مکان پر ہی رہی۔ اس کے بعد بہ لطائف الحیل ایک علیحدہ کمرا لے کر رہنا شروع کیا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی بے پروائی سی ہو گئی تھی۔ جو رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں ان کا تو ذکر کیا، جو ساتھ رہتی تھیں ان کے روپے پیسے سے کوئی واسطہ غرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا بھی کچھ ان کے مزاج کے خلاف نہ گزرا۔ دوسرے تیسرے دن میں جاتی تھی۔ سلام کر کے چلی آتی تھی۔ اس زمانے میں نواب محمود علی خاں صاحب سے مجھ سے تپاک بڑھا۔ پہلے کچھ دنوں تشریف لایا کئے۔ پھر نوکر رکھا، اس کے بعد مجھے پابند کرنا چاہا۔ بھلا مجھ سے کب ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ میں رہوں اور اپنے قدیم ملنے والوں سے ملاقات ترک کر دوں۔ جب میں نے نواب صاحب کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھا، ترک تعلق کرنا چاہا۔ نواب صاحب نے عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ مجھ سے نکاح ہے۔ عجب آفت میں جان پھنسی۔ مقدمے کی

پیروی میں ہزاروں صرف ہوئے۔ عدالت ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوش ہونا پڑا۔ مدتوں چھپی چھپی پھری۔ وکیل کی معرفت اپیل کی۔ اپیل میں نواب صاحب ہارے۔ نواب صاحب نے عدالت عالیہ میں اپیل کی، یہاں بھی ہارے۔ اب ناجائز دھمکیاں دینا شروع کیں۔ "مار ڈالوں گا، ناک کاٹ لوں گا"۔ اس زمانے میں مجھ کو جان کی حفاظت کے لئے دس بارہ آدمی لٹھ بند نوکر رکھنا پڑے۔ جہاں جاتی ہوں، یہ آدمی فینس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ناک میں دم ہوگیا۔ آخر میں نے فوج داری میں مچلکے کا دعویٰ کیا۔ گواہوں سے ثابت کرا دیا کہ بے شک نواب صاحب درپئے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب سے مچلکہ لے لیا۔ اب جاکے جان چھوٹی۔ چھ برس تک ان مقدموں میں پھنسی رہی، خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانے میں نواب صاحب سے مقدمہ لڑ رہا تھا، ایک صاحب اکبر علی خاں نامی مختار پیشہ، چلتے پرزے، آفت کے پرکالے، ناجائز کارروائیوں میں مشاق، جعل سازی میں استاد، جھوٹے مقدمات بنانے میں وحید عصر، عدالت کو دھوکہ دینے میں یکتائے زماں، میری طرف سے پیروکار تھے۔ ان کی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملی۔ حق تو یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں نواب صاحب سے سرپر نہ ہوتی۔ اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے اور مجھ سے نکاح نہ تھا، مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے لئے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا لیکن مقدمہ اس سلیقے سے بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کئے گئے تھے جن کے ماتھوں پر گٹے پڑے ہوئے، بڑے بڑے عمامے سر پر، عبائیں زیب دوش، ہاتھوں میں کنٹھے، پاؤں میں کفشیں، بات بات میں قال اللہ قال الرسول۔ ان کی صورت دیکھ کے حاکم عدالت کیا، کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک بزرگ نکاح کے وکیل بنے تھے اور ایک منکوحہ کے مگر پھر حق حق ہے اور ناحق ناحق، جرح میں بگڑ گئے۔ نواب کے اور گواہ ان سے زیادہ بگڑے، اور انہی گواہوں کی گواہی سے نواب اپیل ہار گئے۔ فوج داری میں میری طرف سے جو گواہ پیش کئے گئے تھے، وہ سب اکبر علی کے بنائے ہوئے تھے، بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خاں کی آمدورفت میرے مکان پر بہت زمانے تک رہی۔ انہوں نے میرے ساتھ پورا حق دوستی کا ادا کیا۔ ایک حبہ نہیں لیا، بلکہ اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ واقعی ان کو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ برے آدمی بالکل برے نہیں ہوتے، کسی نہ کسی

سے بھلے ضرور ہو جاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے چوروں کی نسبت آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی سے دوستی کر لیتے تھے تو اس سے پورا نباہ کرتے تھے۔ بغیر کسی قدر بھلائی کے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص سب سے برا ہو وہ کس کا ہو کے رہے گا۔ جب تک نواب سے مقدمہ رہا، میں کسی اجنبی شخص کو اپنے پاس نہ آنے دیتی تھی، مبادا اس کا بھیجا ہوا ہو، خفیہ خبر لینے آیا ہو اور کسی طرح نقصان پہنچائے۔ اکبر علی خان ایک مرتبہ صبح کو کچہری جاتے وقت اور پھر شام کو کچہری سے پلٹ کے میرے مکان پر آتے تھے۔ شام کو یہیں نماز پڑھتے تھے۔ گھر سے کھانا آتا تھا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مکان سے کھانا منگوانے کی کیا ضرورت، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار بھی نہ تھا۔ میں بھی انہی کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اس زمانے میں میں بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔ اکبر علی خاں کو تعزیہ داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہو یا غلط ان کا اعتقاد یہی تھا۔

رسوا۔ یہ معاملہ ایمان کا ہے، اس لئے اتنا مجھے کہہ لینے دیجئے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

امراؤ۔ میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔

رسوا۔ عقل مندوں نے گناہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے، اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں (اگرچہ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہو)۔ جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے ان کی بخشش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر ان کا برا اثر پڑا ہو۔ تم نے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہوگا۔

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

امراؤ جان! یاد رکھو مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے۔ اس کی بخشش کہیں نہیں ہے۔ اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذ اللہ خدا کی خدائی بے کار ہے۔

امراؤ۔ میاں، میرا تو بال بال گناہ گار ہے، مگر اس سے میں بھی کانپتی ہوں۔

رسوا۔ مگر تم نے دل آزاری بہت کی ہوگی؟

امراؤ۔ پھر یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔ اسی دل آزاری کی بدولت لاکھوں روپے ہم نے کمائے،

مزاردوں اڑائیے۔

رسوا۔ پھر اس کی کیا سزا ہو گی؟

امراؤ۔ اس کی سزا نہ ہونی چاہیئے۔ ہم نے جس قسم کی دل آزاری کی اس میں ایک طرح کی لذت ہے جو اس دل آزاری کا معاوضہ ہو جاتا ہے۔

رسوا۔ کیا خوب!

امراؤ۔ فرض کیجئے ایک صاحب نے ہم کو میلے تماشے میں کہیں دیکھ لیا، مرنے لگے۔ کوڑی پاس نہیں۔ ہم بے لئے مل نہیں سکتے۔ ان کا دل دکھتا ہے، پھر اس میں ہمارا کیا قصور! دوسرے صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ روپیہ بھی دیتے ہیں۔ ہم ایک اور شخص کے پابند ہیں یا ان سے ملنا نہیں چاہتے، اپنا دل۔ ان کی جان پر بنی ہے۔ پھر ہماری بلا سے۔ بعض ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ فقط ہمیں چاہو ہم نہیں چاہتے۔ اجارہ ہے؟ اس سے ان کو صدمہ پہنچتا ہے۔ پھر ہماری پاپوش سے۔

رسوا۔ یہ سب گولی مار دینے کے لائق ہیں۔ مگر برائے خدا! کہیں مجھے ان میں سے کسی میں شمار نہ کر لیجئے گا۔

امراؤ۔ خدا نہ کرے۔ آپ خوش باشوں میں ہیں۔ نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں، نہ کوئی آپ کو چاہتا ہے اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔

رسوا۔ یہ کیا کہا؟ ایک بات ہے اور نہیں بھی ہے۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

امراؤ۔ میں منطق تو زیادہ پڑھی نہیں مگر ہو سکتا ہے۔ جب ایک بات کے دو پیرائے ہوں۔ ایک چاہنا عقل مندی کے ساتھ ہے اور ایک بے وقوفی کے ساتھ۔

رسوا۔ اس کی مثال؟

امراؤ۔ پہلے کی مثال جیسے آپ مجھ کو چاہتے ہیں، میں آپ کو۔

رسوا۔ خیر میرے چاہنے کا حال تو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور آپ کے چاہنے کا حال آپ کے اقرار سے معلوم ہو گیا۔ آگے چلئے، دوسری مثال۔

امراؤ۔ خیر اگر نہیں چاہتے تو میرا برا چاہتے ہوں گے۔ دوسرے کی مثال سنئے۔ جیسے فریاد رس الٰہی۔

رسوا۔ نہیں اس مثال پر آپ نے غلطی کی۔ اور کوئی مثال دیجئے۔

امراؤ۔ اچھا جیسے قیس لیلیٰ کو چاہتا تھا۔

رسوا۔ آپ بھی کیا دقیانوسی مثال ڈھونڈ کے لائی ہیں۔

امراؤ۔ اچھا جیسے ---- نظیر ----

رسوا۔ (بات کاٹ کے) اس مثال سے معاف کیجئے۔ اس موقع پر مجھ کو ایک شعر یاد آیا ہے، سن لیجئے اور اپنا قصہ دہرائیے۔

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم
ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے

امراؤ۔ ہاں وہ کلکتے والا معاملہ؟

رسوا۔ اتنی دور کہاں پہنچ گئیں۔ کیا لکھنؤ میں ایسے نہیں رہتے؟

امراؤ۔ دنیا خالی نہیں ہے۔

رسوا۔ ہاں میں نے سنا تھا، آپ اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئی تھیں؟

امراؤ۔ مجھ سے سنئے، جس زمانے میں نواب عدالت ابتدائی سے جیت گئے ہیں اور میں روپوش ہوئی ہوں، اس زمانے میں اکبر علی خاں مجھے اپنے مکان پر لے گئے تھے۔ کئی برس رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں تین آدمی اس دھوکے میں تھے کہ میں اکبر علی کے گھر بیٹھ گئی۔ ایک تو خود اکبر علی، دوسرے ان کی بیوی، تیسرے کا نام نہ بتاؤں گی۔

رسوا۔ میں بتا دوں؟

امراؤ۔ گوہر مرزا؟

رسوا۔ جی نہیں!

امراؤ۔ تو پھر اور کون؟ بتائیے۔

رسوا۔ آپ بتائیے۔

امراؤ۔ ایسے فقرے کسی اور کو دیجئے گا۔

رسوا۔ فقرہ کیسا! میں ایک پرچے پر لکھ کے رکھ دیتا ہوں، پھر آپ بتائیے۔

امراؤ:- بہتر۔
رسوا:- پرچہ لکھ کے رکھ دیا۔ اب کہئے۔
امراؤ:- تیسرے میں خود۔
(پرچے میں لکھا تھا "آپ خود")
امراؤ:- واہ مرزا صاحب! خوب پہچانا۔
رسوا:- آپ کی عنایت ہے۔ ہاں تو کیا گزری؟
امراؤ:- گزری کیا، سنیئے۔

اول تو انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں لے جا کے اتارا جو ان کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ کھڑکی درمیان تھی۔ موا کچا سا مکان، ایک چھوٹی سی دلنیہ، آگے چھپر۔ ایک اور چھپر سامنے پڑا ہوا۔ اس میں دو چولہے بنے ہوئے۔ یہ کیا ہے؟ باورچی خانہ اور سب خانے بھی ایسے ہی سمجھ لیجئے۔ اسی مکان میں میں بھی رہوں اور میاں کے بے تکلف دوست بھی آیا جایا۔ ان میں سے ایک صاحب رئیس موضع شیخ افضل حسین چھوٹتے ہی "بھوجی" کہنے لگے۔ ان کے بے تکے پن نے ناک میں دم کر دیا۔ پانوں کی فرمائش سے تنگ ہو گئی۔ ہر سنٹے "بھوجی پان نہ کھلاؤ گی؟"

ایک دن دو دن، آخر مروت کہاں تک۔ انتہا یہ کہ پان دان میں نے ان کے آگے سرکا دیا۔ اس دن سے میں خود دست بردار ہو گئی۔ انہوں نے قبضہ کر لیا، جیسے کوئی مال موروثی پر قبضہ کرتا ہے۔ پان اس بد تمیزی سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ نفرت ہو جائے۔ کتھے چونے کی کلھیوں میں انگلیاں پڑ رہی ہیں، زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ میں نے جب یہ قرینہ دیکھا، چکنی کے چورے اور الائچی پر بسر کرنے لگی۔ اس میں بھی وہ ساجھا لگاتے تھے۔ ایک اور صاحب واجد علی نامی اکثر کھانے کے وقت ضرور تشریف لاتے تھے۔ اب یاد نہیں۔ اکبر علی خاں کے برادر نسبتی تھے۔ ان کے مذاق میں فحش حد اعتدال سے زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علی خاں صاحب کے بے تکلف احباب بہت سے تھے جن میں سے اکثر کو مقدمہ بازی کا شوق تھا۔ دن رات قانون چھنٹا کرتا تھا۔ مگر جب مرزا صاحب تشریف لے جاتے تو ذرا امن ہو جاتا تھا، کیونکہ انہیں مقدموں کی باتیں سننے سے نفرت تھی۔

اس مکان سے چند روز کے بعد میری طبیعت حد سے زیادہ اکتا گئی۔ قریب تھا کہ کہیں اور رہنے کا بندوبست کروں، کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علی کسی مقدمے میں فیض آباد گئے، افضل

حسین اپنے گاؤں۔ اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں ہے۔ دروازے کی کنڈی بند کر لی ہے۔ میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی، جو زنانے مکان کی دیوار میں تھی، کھلی اور اکبر علی خاں کی بیوی اندر چلی آئیں۔ مجھے خواہی نہ خواہی سلام کرنا پڑا۔ انگنائی میں تختوں کا چوکا بچھا تھا۔ اسی کے پاس میرا پلنگ لگا تھا۔ پہلے بڑی دیر تک چپکی کھڑی رہیں۔ آخر میں نے کہا۔ "یا اللہ بیٹھ جایئے۔" بارے بیٹھ گئیں۔

میں:- ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی۔ آج ادھر کہاں تشریف آئی۔
بیوی:- تم کو میرا آنا ناگوار ہو تو چلی جاؤں۔
میں:- جی نہیں، آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم تو مناسب بھی ہے۔
بیوی:- لے باتیں نہ بناؤ۔ اگر میرا گھر ہے تو تمہارا بھی گھر ہے۔ اور سچ پوچھو تو نہ میرا نہ تمہارا، گھر تو گھر والے کا ہے۔
میں:- جی نہیں! خدا رکھے آپ کے گھر والے کو، ان کا بھی ہے اور آپ کا بھی۔
بیوی:- یہ تم اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ ادھر کیوں نہیں چلی آتیں۔ ہاں میاں کا حکم ہو گا۔
میں:- میاں کے حکم کی کچھ ایسی تابع نہیں ہوں۔ ہاں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی، وہ حاصل ہو گئی۔ اب حاضر ہوں گی۔
بیوی:- اچھا تو چلئے۔
میں:- چلئے۔

مکان میں جا کر جو دیکھتی ہوں، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ تانبے کے مٹکے، دیگ، گگرے، پتیلیاں، لوٹے، نواڑی پلنگ، مسہری، تختوں کی چوکیاں، فرش فروش، مگر کسی بات کا قرینہ نہیں۔ انگنائی میں جا بجا کوڑا پڑا ہے۔ باورچی خانے میں سامنے بوا امیرن کھانا پکا رہی ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ تختوں کے چوکے پر پیک کے چھلکے پڑے ہوئے۔ بیوی کے پلنگ پر منوں کوڑا۔ ماما نے پان دان لا کے بیوی کے سامنے رکھ دیا۔ کتھے چونے کے دھبوں میں سارا پان دان چھپا ہوا تھا۔ دیکھ کے میرا جی مالش کرنے لگا۔

بیوی نے پان لگا کے دیا، میں نے چٹکی میں دبا لیا، باتیں کرنے لگی۔ اسی اثنا میں محلہ کی ایک بڑھیا آ نکلی۔ زمین پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ بیوی سے (میری طرف) اشارہ کر کے پوچھا "یہ کون ہیں؟"

بیوی:- اب تمہیں کیا بتاؤں؟

میں چپکی بیٹھی رہی۔ بڑھیا (اکبر علی خاں کی بیوی سے)

بڑھیا:- اوئی! جیسے میں جانتی نہیں۔

میں:- بڑی بی! پھر جانتی ہو تو پوچھنا کیا۔

بڑھیا:- اوئی بی! تم سے بات نہیں کرتی۔ میں تو اپنی بہو صاحب سے پوچھتی ہوں۔ میرا منہ تم سے بات کرنے کے لائق نہیں۔ تم بڑی آدمی ہو۔

میں بڑھیا کا منہ دیکھ کے چپ ہو رہی۔

بیوی:- اوہی بڑھیا! ذرا سی بات میں جھاڑ کا کانٹا ہو گئی۔

بڑھیا:- (بیوی سے) تم تو اس طرح بات چھپاتی ہو جیسے ہم دشمن ہیں۔ اے لو، ہم تو ان کی بھلائی کے لئے بات کرتے ہیں، یہ ہمی سے الٹے بگڑتی ہیں۔

بیوی:- لے بس، اپنی خیر خواہی رہنے دو۔ بوا! تم کسی کے گھر کی اجارہ دار ہو؟

بڑھیا:- ہمارا اجارہ کیوں ہونے لگا۔ اب جو نئی نئی آتی جائیں گی ان کا اجارہ ہوتا جائے گا۔

بڑھیا کی اس بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ منہ پھیر کے ہنسنے لگی۔

بیوی:- کیوں نہیں، اے تم بھی میری سوت ہو نا۔ (میری طرف مخاطب ہو کے) سن لو، خان صاحب کی پہلی یہی ہیں۔ لو بیوی تم اصل میں ان کی سوت ہو۔ میں تو ان کے بعد آئی ہوں۔

بڑھیا:- وہ سوت ہوں اپنے ہوتے سوتوں کی۔ مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ منہ در منہ گالیاں دیتی ہو۔ موئی کسبیوں، نانگیوں کی صحبت میں اور کیا سیکھو گی۔ اتنے دن مجھے آتے ہوئے، بڑی بیگم صاحب (اکبر علی خاں کی والدہ) نے آدھی بات مجھے نہیں کہی۔ بہو صاحب گنونتی ایسی ہیں کہ محلے کی بڑھیوں کو گالیاں دیتی ہیں۔

بیوی:- (غصہ ہو کر) میں نے تم سے کہہ دیا مدن کی ماں! تم آج سے میرے پاس نہ آنا۔ وہیں بڑی بیگم کے پاس جا کر بیٹھا کرو۔

مجھے بھی بہت غصہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ بے تکی عورت ہے۔ اس کے منہ کون لگے، ضبط کر کے چپکی ہو رہی۔

بڑھیا:- ہماری بلا آتی ہے-----

بیوی:- موئی کی شامتیں آئی ہیں۔ یہ بلا لوغمہ کیا بک رہی ہے۔

بڑھیا:- تو کیا تمہارے دبیل ہیں؟ کچھ کسی کے لینے میں نہیں۔ گھڑی بھر نکل آتے تھے۔ تم ہم سے ہم تم سے بات کرتے تھے۔ نہ آئیں گے۔

بیوی:- ہرگز نہ آنا۔

بڑھیا:- اس ضد پر تو ضرور آئیں گے۔ دیکھیں تو تم ہمارا کیا بنا لیتی ہو۔

بیوی:- آؤ گی تو اتنی جوتیاں لگائیں گے کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔

بڑھیا:- کیا تاکت، کیا مجال۔ منہ ہنواؤ۔ جوتیاں ماریں گی، بڑی بے چاری۔

بیوی:- لے اٹھو، یہاں سے ٹہلو۔ نہیں تو لیتی ہوں ہاتھ میں جوتی۔

بڑھیا:- (ایک ٹھٹھا لگا کے) آج تو ہم جوتیاں کھا کے ہی جائیں گے۔ مارو بڑے باپ کی بیٹی ہو تو۔

باپ کے نام پر بیوی کو غصہ آگیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ تھر تھر کانپنے لگیں۔

بیوی:- دور ہو یہاں سے، کہتی ہوں۔

بڑھیا:- اب تو ہم جوتیاں کھا کے ہی جائیں گے۔

بیوی:- (مجھ سے مخاطب ہو کے) دیکھو یہ مجھے ضد دلا رہی ہے۔ بے مارے موئی کو نہ چھوڑوں گی۔

میں:- بیگم جانے دیجئے۔ موئی بے تکی ہے۔

بڑھیا:- (مجھ سے) تو کچھ نہ بولنا۔ مال زادی، تجھے کچا ہی کھا جاؤں گی۔

بیوی:- (جوتی پیر سے لے کر) ایک دو تین۔ اب راضی ہو؟

میں:- بیگم جانے دیجئے۔ (ہاتھ سے جوتی چھین لی)

بیوی:- نہیں تم نہ بولو۔ موئی کا کچومر نکال ڈالوں گی۔

بڑھیا:- اور مارو۔

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اتار کر چار پانچ اور لگائیں۔ اب تو بڑھیا نے زمین پر پاؤں پھیلا دیئے اور دو ہتھڑ مارنا شروع کیا۔ "ہے ہے! ہے ہے! مجھے جوتیاں ماریں۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ سوت کی جلن مجھ پر اتاری۔ ہائے مارا! ہائے مارا"۔ چلا چلا کے دہائی دینا شروع کی۔ باورچی خانے سے بوا امیرن الٰہ کے دوڑیں۔ بیگم صاحب اپنے دالان میں چلی آئیں۔ ایک آفت برپا ہو گئی۔

بڑی بیگم صاحب کو آتے دیکھ کر اور بھی دو ہتڑ مارنا شروع کئے۔ "اس بڑھاپے میں مجھے جوتیاں کھلوائیں۔"

بیگم صاحب:۔ ے مجھے کیا معلوم تھا کہ تم پر جوتیاں پڑ رہی ہیں۔ نہیں تو آ کے بچا لیتی۔ آخر بات کیا ہوئی؟

بڑھیا:۔ (میری طرف اشارہ کر کے) اس مال زادی نے مار کھلوائی۔ ارے اس نے مار کھلوائی۔

میں ٹھک ماری سی ہو گئی۔ بیگم صاحب سے مجھ سے اس وقت سامنا ہوا، کچھ کہتے نہیں بن پڑتا۔

بیوی:۔ پھر ان کا نام لئے جاتی ہے۔

بڑھیا:۔ ہم تو نام لیں گے۔ دیکھیں تم کیا کرتی ہو۔

بیگم صاحب:۔ آخر ہوا کیا تھا؟

بڑھیا:۔ مجھ نگوڑی نے اتنا پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ ے بھلا کیا گناہ کیا؟

بیوی:۔ تم تو کہتی تھیں میں جانتی ہوں، پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟

بڑھیا:۔ کیا مطلب تھا؟ اچھا مطلب بتا دوں گی۔ تو سہی جو اپنا عوض نہ لے لوں۔ تم نے مارا تو ہے۔

بیگم:۔ چل شفتل، تو کیا بدلہ لے گی؟ ذرا کسی بھلاوے پر نہ پھولنا۔

بڑھیا:۔ میں تم سے کچھ نہیں کہتی۔ تم جو چاہو کہہ لو۔ تمہارا ہک ہے۔

بیگم:۔ تیری ہک والی کی ایسی تیسی۔ نکل یہاں سے۔

بڑھیا:۔ لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔ اچھا جاتے ہیں۔

(یہ کہہ کے بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ لہنگا جھاڑ جھوڑ بڑبڑاتی ہوئی) بڑی نکالنے والی۔ جاتے ہیں۔ دیکھیں تو کیوں کر نہیں آنے دیتیں۔

بیگم:۔ (بہو سے) آخر تم اس موئی چڑیل کے منہ کیوں لگیں؟

بیوی:۔ اماں جان! آپ کے سر کی قسم! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو آپ ہی جیسے کوئی کھری کھلٹ پرے سو کے آئی تھی۔ سیکڑوں باتیں تو ان بے چاری کو سنا کے رکھ دیں۔

بیگم صاحب میرے ذکر پر کچھ ناک بھوں چڑھا کے چپکی ہو گئیں۔ مجھ کو اس بڑھیا کی بات تو

ناگوار نہیں ہوئی، کیوں کہ میں اسے دیوانی سمجھے ہوئے تھی، مگر ہاں بیگم صاحب کی بے اعتنائی سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ ابھی وہیں کھڑی تھیں کہ میں اٹھ کے کھڑکی کے پاس چلی آئی اور اپنے مکان میں آن بیٹھی۔

بیگم صاحب:۔ (میرے چلے آنے کے بعد بہو سے) اوئی بیٹا! تم نے تو اس بڑھیا نگوڑی کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا، پھر موئی ایک شفتل بازاری کے لئے۔ آخر تمہیں اس کی پرچک لینا کیا ضروری تھی۔

امیرن:۔ اچھا اس کو جانے دیجئے۔ جیسی اس نے بدزبانی کی تھی، اپنی سزا کو پہنچی۔ یہ پوچھئے کہ کسبی خانگیوں سے میل جول کیسا؟ اور کسبی بھی وہ جس سے میاں سے آشنائی ہو۔ ابھی وہ لا کے سر پر بٹھا دیتے تو کیسی کیسی ملامت ڈالتی۔ اور خود فرض کر کے جا کے بلا لائیں؟

بیگم:۔ (امیرن سے) اس کی مجال تھی گھر میں لے آتا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ باہر جس کا جی چاہے آئے، گھر میں کسی کا کیا کام ہے۔ اے لو ان سے (اکبر علی خاں کے باپ) برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی۔ اس نے کیسی منتیں کیں۔ میں نے نہیں ہامی بھری۔ بوا امیرن! میں یہ سوچی کہ آج کو مہمان طریق کھڑی تڑی چلی آئے گی، کل کو میاں گھر میں بٹھا لیں گے۔ تو یہ چھاتی پر مونگ کون دلوائے گا۔ اپنی پت اپنے ہاتھ ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیوں کو اپنے آگم اندیشے کا خیال نہیں۔

امیرن:۔ سچ ہے بیگم صاحب! اول تو مونڈھے پر بیٹھنے والیوں کا گھر گرہستیوں میں کام ہی کیا ہے۔ اگلے لوگ کہتے تھے:۔ ایک درجہ مرد کو گھر میں بلا لے، بد عورتوں کو نہ بلائے۔

بیگم:۔ بوا! بات یہ ہے کہ مرد اگر چلا بھی آئے گا تو کیا وہ عورتوں میں گھس کے بیٹھے گا۔ کل کی بات ہے، بھاگڑ کے دنوں میں برسوں حسین خاں ہمارے گھر میں چھپے رہے۔ پھر بوا ایک گھر کا سہنا رہنا، مگر مجال ہے کہ انہوں نے میرا آنچل تک دیکھا ہو، یا بات سنی ہو۔ دن دن بھر صحنچی میں گھسی بیٹھی رہتی تھی۔ ماما اصیلوں سے اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔

امیرن:۔ ایک تو یہ کہ تم صحنک کی کھانے والی بیوی صاحب زادی۔ جب ایسوں کے پاس بیٹھو گی، کہاں تک براؤ ہو گا۔ کہیں اس نے کتھے چونے کی کلھیوں میں ہاتھ ڈال دیا،

تمہاری آنکھ بچا کے کٹوری میں پانی پی لیا! دوسرے موئی نکاہیاں ان کا ایجبار (اعتبار) کیا؟ سینکڑوں عارضوں میں گھری ہوتی ہیں۔ ان کی تو پرچھاویں سے بچنا چاہیئے۔

بیگم صاحب۔ ایک بات؟ سبھی باتوں کا براؤ ہونا چاہیئے۔ پرچھانواں، نا نگھن، ٹونے، ٹوٹکے۔ بوا کون کہے۔ ان کو تو سمجھ نہیں۔ اور جو کچھ کھلا ہی دے۔ مرزا محمود علی کی بہو کو سوت نے جو نمک کھلا دی۔ دین و دنیا سے جاتی رہی۔ نہ آل کی نہ اولاد کی۔

امیرن۔ جی ہاں! اے لو کیا میں جانتی نہیں۔

بیگم۔ یہ سوتاپے کا ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ اس میں جہاں تک الگ تھلگ رہے اچھا۔ یوں تو الگ تھلگ رہنے پر بھی جان نہیں بچتی۔ مجھی کو دیکھو۔ اس موئی نکے کی کہاری نے کیا کوئی بات اٹھا رکھی؟ دعا، تعویذ، گنڈے، کیسے کیسے نقش میرے سرہانے سے نکلتے تھے۔

امیرن۔ پھر اس ۔۔۔۔ کو اپنے گھر میں کیوں آنے دیا۔

بیگم۔ اے بوا! نوکر تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میاں سے لگا سگا ہے۔ جس دن معلوم ہو گیا، میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔

امیرن۔ مگر بیگم! ایک بات کہوں گی خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔

بیگم۔ یہ خوب کہی۔ میاں کو چھینا تھا۔ اب کیا اس سے بھی گئی گزری۔ اس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو؟ اس سے بھی کسی زمانے میں میاں سے تھی۔

امیرن۔ (قہقہہ لگا کے) نہیں بیگم صاحب!

بیگم۔ کیا میں جھوٹ کہوں گی؟ جب ہی تو وہ دہراتی تھی کہ اپنا عوض لے لوں گی۔

امیرن۔ بہو صاحب! تو پھر آپ کو نہیں چاہیئے تھا۔ سسرے کی حرم کو اپنی جوتیاں ۔۔۔۔،

بیگم۔ بوا! ان لوگوں کو یہ لحاظ کہاں۔ سچ کہوں مجھے بھی یہ بات ناگوار ہوئی، ان کے منہ پر کہتی ہوں۔ آج کو موئی نکہائی کے چلتے سسرے کی حرم کے جوتیاں ماریں، کل ساس کو ماریں گی۔

امیرن۔ نہیں خدا نہ کرے۔ مگر ہاں بات کہنے ہی میں آتی ہے۔

ان دونوں بڑھیوں نے بہو صاحب بے چاری کو ایسے کونچے دیئے کہ آخر ہچکیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا یہ حال تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھیوں کا منہ نوچ

لوں۔

رسوا۔ ہائیں ہائیں یہ غصہ!

روکیے کا ذرا طبیعت کو
کہیں ایسا نہ ہو کہ خفت ہو

امراؤ۔ مرزا صاحب! غصے کی بات ہی تھی۔ ایک انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

رسوا۔ میرے نزدیک تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا۔ وہ دونوں بڑھیاں سچ کہتی تھیں۔ اور مدن کی ماں بے چاری ناحق پٹی۔ حق تو یوں ہے اب آپ چاہے برا مانیں چاہے بھلا۔

امراؤ۔ واہ مرزا صاحب! آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔

رسوا۔ جی ہاں میرے نزدیک انصاف یہی ہے۔ اس معاملے میں آپ بھی ایک حد تک بے قصور تھیں۔ سارا قصور اکبر علی کی بیوی کا تھا۔

امراؤ۔ ان بے چاری کا کیا قصور تھا؟

رسوا۔ ایسا قصور تھا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو فوراً ڈولی بلوا کے میکے بھجوا دیتا اور چھ مہینے تک صورت نہ دیکھتا۔ اچھا ایک بات پوچھتے ہیں۔ اکبر علی خاں نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا؟

امراؤ۔ مدن کی ماں پر خوب بگڑے، خوب چلائے کہہ دیا خبردار! یہ ڈائن ہمارے گھر نہ آنے پائے۔ کئی مہینے تک اس کا آنا جانا موقوف رہا۔ جب بڑے خان صاحب آئے تو پھر آنے لگی۔ یہ قصہ ان کے آگے چھیڑا گیا تھا۔ وہ الٹے اکبر علی خاں کی بیوی پر خفا ہوئے۔

رسوا۔ بڑھے کی عقل صحیح تھی۔

امراؤ۔ صحیح تھی یا سٹھیا گئے تھے! ذرا مدن کی ماں پاؤں دبایا کرتی تھی، اسی سے اس کی پرچک لیتے تھے۔ کیوں نہ پرچک لیتے، مدن کی ماں ان کی پرانی آشنا تھی۔

رسوا۔ پھر آپ ہی قائل ہو جیئے۔ یہ عین وضع داری تھی۔ اچھا اب ایک بات اور بتا دیجئے۔ مدن کی ماں جوانی میں کوئی رنڈی تھی یا گھر گرہست۔ اور بوا امیرن کون تھیں؟

امراؤ۔ مدن کی ماں موئی دھنیتی تھی۔ جوانی میں خراب ہو گئی تھی۔ بوا امیرن ایک دیہاتی عورت تھیں۔ ان کا مکان سندیلہ کے ضلع میں تھا۔ ایک جوان بیٹا تھا۔ وہ بھی بڑے خان صاحب کے پاس نوکر تھا۔ ایک لڑکی تھی۔ وہ کہیں باہر بیاہی ہوئی تھی۔

رسوا۔ بوا امیرن سے اور بڑے خان صاحب سے تو کوئی تعلق نہ تھا۔

امراؤ۔ نہ۔ خدا کو جواب دینا ہے۔ امیرن بڑی نیک عورت تھی۔ سارا محلہ کہتا تھا کہ وہ جوانی میں رانڈ ہو کر یہاں نوکری کو آئی تھی۔ اس دن سے کسی نے اس کو بدراہ نہیں دیکھا۔

رسوا۔ پورے واقعات آپ کے بیان سے مجھ کو معلوم ہو گئے۔ اب پوچھئے کیا پوچھتی ہیں۔

امراؤ۔ تو کیا کوئی مقدمہ آپ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔

رسوا۔ بہت بڑا مقدمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک نیک بختیں، دوسری خرابیں، تیسری بازاریاں۔ اور دوسرے قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں۔ دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکاری پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ نیک بختوں کے ساتھ وہی عورتیں مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہو گئی ہوں۔ کیا تمہیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بیچاریاں جو تمام عمر چار دیواریوں میں قید رہتی ہیں۔ ہزارہا قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں، اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں، مگر برے وقت میں یہی بیچاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

جس زمانے میں ان کے شوہر جوان ہوتے ہیں، دولت پاس ہوتی ہے، تو اکثر باہر والیاں مزے اڑاتی ہیں، مگر مفلسی اور بڑھاپے کے زمانے میں کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ان وقتوں میں وہی طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہیں اور بروں کی جان کو صبر کرتی ہیں۔ پھر کیا انہیں اس کا کوئی فخر نہ ہو گا۔ یہی فخر اس کا باعث ہوتا ہے کہ وہ خراب عورتوں کو بہت ہی بری نگاہ سے دیکھتی ہیں، انتہا کا ذلیل سمجھتی ہیں۔ توبہ استغفار سے خدا گناہ معاف کر دیتا ہے مگر یہ عورتیں کبھی معاف نہیں کرتیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گھر کی عورت کیسی ہی خوبصورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ ہو، بے وقوف مرد بازاریوں پر، جو ان سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں، فریفتہ ہو کر انہیں عارضی طور سے یا مدت العمر کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی نہ کسی قسم کا جادو ٹونا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آ جاتا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے، اس لئے کہ وہ اس حال میں بھی اپنے مردوں کو

الزام نہیں دیتیں، بلکہ بدکار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی محبت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

امراؤ۔ یہ تو سب صحیح ہے، مگر مرد کیوں ایسے بیوقوف بن جاتے ہیں۔

رسوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں جدت پسندی ہے۔ ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے، خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، طبیعت اکتا جاتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کا تغیر اس کی حالت زندگی میں پیدا ہو۔ شاہدان بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے میں اسے ایک قسم کی نئی لذت ملتی ہے جو کبھی اس کے خیال میں نہ تھی۔ یہاں بھی ایک ہی کے تعارف پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ جدت کی تلاش میں روز نئے کمروں میں پہنچتا ہے اور نئے گھر دیکھتا پھرتا ہے۔

امراؤ۔ مگر سب مرد ایسے نہیں ہیں۔

رسوا۔ ہاں یہ سچ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن معاشرت کے قانون نے اس امر کو معیوب قرار دیا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے عزیز و اقارب، دوست احباب ملامت کرتے ہیں۔ اس خوف سے اکثر کی جرات نہیں ہوتی۔ مگر جب اخوان الشیاطین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے، وہ طرح طرح کی لذتوں کا ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق ان کی طبیعت میں پیدا کر دیتے ہیں، اس لئے وہ خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ آپ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہو گا کہ جو لوگ پہلے پہل رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں ان کو اخفائے راز کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔ کوئی دیکھتا نہ ہو، کوئی سن نہ لے۔ دو آدمیوں کے سامنے تو بولنے کا کیا ذکر، تخلیہ میں بھی منہ سے بات نہیں نکلتی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ حالت بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر کیا ہے، دن دہاڑے سر چوک رنڈیوں کے کمروں پر کھٹ کھٹ کر کے چڑھ جانا گاڑی میں کھڑکیاں کھول کر ساتھ بیٹھ کر سیر کرنا ہاتھ میں ہاتھ لے کے میلے تماشوں میں لئے پھرنا ان سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں۔

امراؤ۔ یہ تو صحیح ہے، مگر شہروں میں ان باتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے۔

رسوا۔ خصوصاً دہلی اور لکھنؤ میں۔ اور یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔

دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو نوجوانوں کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اس قدر اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس لئے وہ رؤسا اور زمینداروں کی مطیع فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں، کیوں کہ ان کا آذوقہ بلکہ زندگی ان کے دست قدرت میں ہے۔ اس لئے ان کی اولاد سے بہت ہی چھپے چوری ملتی ہیں۔ اور شہروں میں تو آزادی ہے۔ کون کس کا دباؤ مانتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔

امراؤ۔ مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں، مثلاً میاں ارشاد علی کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جب ان کو ان کا چسکا پڑتا ہے تو وہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ اور اہل شہر کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو زیادہ شغف اور انہماک نہیں ہوتا۔

(2)

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل

رسوا۔ ہاں! وہ آپ کی نوچی کیا ہوئی؟ اے بھلا سا نام تھا۔

امراؤ۔ آبادی؟

رسوا۔ آبادی۔ صورت تو اچھی تھی۔ میں نے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا سن دس بارہ برس کا تھا۔ جوانی میں تو اور نکھر گئی ہوگی۔

امراؤ۔ مرزا صاحب! آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا۔ یاد کو کیا چاہئے۔ واقعے میں بہت قطع دار عورت ہوگی۔ ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جوان ہوگی۔

امراؤ۔ تو یہ کہئے کہ آپ بھی بی آبادی کے امیدواروں میں تھے۔

رسوا۔ سنو، امراؤ جان! میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے، مجھے

ضرور یاد کر لینا۔ اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا اور جو (خدانخواستہ) میں مر جاؤں تو میرے نام پر فاتحہ دے دینا۔

امراؤ۔ اور اگر کوئی مرد حسین نظر آئے؟

رسوا۔ اپنا نام اس کے امیدواروں میں اور میرا نام اس کی بہن کے امیدواروں میں لکھوا دینا، بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو۔

امراؤ۔ کیا خوب! شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔

رسوا۔ شرع کا دخل کہاں نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری شرع جس میں کوئی فروگذاشت نہیں کی گئی۔

امراؤ۔ سیدھی سی ایک یہ بات کیوں نہیں کہہ دیتے۔ ع

شرعاً تو جانتے نہیں، عرفاً درست ہے

رسوا۔ یہ اور موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ امراؤ جان! میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں، بہن کے برابر سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی قوم و ملت کی کیوں نہ ہو۔ اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو ورغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، میری رائے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ہے۔

امراؤ۔ سبحان اللہ!

رسوا۔ خیر اب اس فضولیات کو رہنے دیجئے۔ آبادی جان کا حال کہئے۔

امراؤ۔ مرزا صاحب! اگر آپ اس کو جوانی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شعر ضرور آپ کی زبان پر ہوتا۔

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل
کہاں کی پاک بازی، ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

جوان ہو کے اس نے وہ شکل و صورت نکالی تھی کہ سو پچاس رنڈیوں میں ایک تھی۔

رسوا۔ اب کیا ہوئی۔ خدا کے لئے جلدی کہئے۔ مرج شہر چلی گئی، مر گئی، آخر آفت ہی کیا ہوئی

جو آپ ایسی مایوسی کے کلمات کہتی ہیں۔

امراؤ۔ ہم سے گئی جہان سے گئی۔

رسوا۔ آخر ہے اب کہاں؟

امراؤ۔ اسپتال میں ہے اور کہاں ہے۔

رسوا۔ یہ کہیے کل جوانی شگفت۔

امراؤ۔ جی ماشاء اللہ سے خوب پھلیں پھولیں۔ صورت بگڑ گئی، رنگت الٹا توا ہو گئی، ناک بیٹھ گئی، تمام بدن میں چھتے پڑ گئے، بال گر گئے، غرضیکہ ستر کرم ہو گئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں۔

رسوا۔ یہ ہوا کیا تھا؟

امراؤ۔ اے ہے، ہوا کیا تھا۔ موئی لونڈوں گھیری، سفلی، چھچھوری۔ میں نے بہت چاہا کہ آدمی بنے مگر نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا۔ استاد کو نوکر رکھا، تعلیم دینا شروع کی، مگر اس کا دیدہ ایسی باتوں میں کب لگتا تھا۔ جب سے جوان ہوئی، میں نے کمرا علیحدہ کر دیا تھا۔ شہر کے چند ذات شریف آ کے بیٹھنے لگے۔ دن رات گالم گلوچ، دھینگا مشتی، جوتم جاتا۔ ایک آفت برپا رہتی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی پر بند نہیں۔ جو آیا وارد۔ میں نے مارا، پیٹا، سمجھایا، مگر وہ کب سنتی تھی۔ بچپنے ہی سے اس کی نگاہ بد تھی۔ اس زمانے میں بوا حسینی کا نواسہ جمن آیا کرتا تھا۔ اس سے کھیلا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا بچے ہیں، کھیلنے دو۔ آخر کچھ ایسی باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جمن کی آمدورفت موقوف ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ذرا خوش گلو تھے۔ میں گوایا کرتی تھی۔ ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ شریف خاندان سے تھے مگر طبیعت پاجی تھی۔ نہ میرا لحاظ کیا، نہ اپنی حیثیت دیکھی۔ ایک دن سرشام کیا دیکھتی ہوں، ڈیوڑھی میں بی آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں۔

چھٹن صاحب۔ اری میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ ہائے آبادی کیا کروں۔ امراؤ جان سے ڈرتا ہوں۔

آبادی۔ ہٹو! ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔ ڈر کا ہے کا؟

چھٹن نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا "ظالم کیا پیاری پیاری صورت ہے۔"

آبادی۔ پھر تمہیں کیا؟

چھٹن۔ (ایک بوسہ لے کر) ہمیں کیا؟ جان جاتی ہے، مرتے ہیں۔

آبادی۔ موئے چار آنے تو دیئے نہیں جاتے، مرتے ہیں! مرتے سب کو دیکھا، جنازہ کسی کا نہیں دیکھا۔

چھٹن۔ چار آنے؟ جان حاضر ہے۔

آبادی۔ نگوڑی جان کو میں لے کر کیا کروں گی؟

چھٹن۔ لو ہماری جان کسی کام کی ہی نہیں۔

آبادی۔ لے اب باتیں نہ بناؤ۔ چونی جیب میں پڑی ہو تو دیتے جاؤ۔

چھٹن۔ واللہ! اماں کی تنخواہ نہیں بٹی۔ پرسوں ضرور ضرور لیتا آؤں گا۔

آبادی۔ اچھا تو جان چھوڑو، جاؤ۔

چھٹن۔ اچھا تو ایک بوسہ تو اور دے دو۔

آبادی کو چھٹن نے گلے لگایا۔ آبادی نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کہیں اتفاق سے تین پیسے پڑے ہوئے تھے، نکال لئے۔

چھٹن۔ تمہیں ہمارے سر کی قسم! یہ پیسے نہ لینا۔ باجی نے رنگ کی پڑیاں اور مسی منگائی ہے۔

آبادی۔ تمہارے سر کی قسم! میں تو نہ دوں گی۔

چھٹن۔ آخر کیا کرو گی۔ پرسوں چونی لے لینا۔

آبادی۔ واہ! خاگینہ لیں گے۔

چھٹن۔ تین پیسے کا خاگینہ! اچھا ایک پیسہ لے لو۔

آبادی۔ تین پیسے کا خاگینہ کچھ بہت ہوا؟ نگوڑا بہت دن سے جی چاہتا ہے۔ بیوی لینے نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں پیٹ میں درد ہو گا۔ میں تو ایک دن چھپا کے ایک آنے کا خاگینہ کھا گئی، کچھ بھی نہیں ہوا۔

(میں نے دل میں کہا کیوں نہ ہو۔ موئی کال کی ماری بلانوش۔ ہم تو ذرا سا بھی کھا لیں تو بدہضمی ہو جائے)۔

رسوا۔ کیا اسے کال میں لیا تھا؟

امراؤ۔ جی ہاں! ایک روپیہ کو ماں بیچ گئی تھی۔ تین دن کے فاقے سے تھی۔ میں نے روٹی

کھلائی اور ایک روپیہ دیا۔ مرزا صاحب مجھے بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں نے تو کہا تھا، میرے پاس رہ، مگر نہ رہی۔

رسوا۔ کم بخت کبھی پھر بھی آئی تھی؟

امراؤ۔ جی! کئی دفعہ آئی۔ لڑکی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ مجھ کو دعائیں دیتی تھی۔ سال میں ایک دو مرتبہ آجایا کرتی تھی۔ مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا سلوک کرتی تھی۔ اب کئی برس سے نہیں آئی، خدا جانے جیتی ہے یا مر گئی ہے۔

رسوا۔ ذات کیا تھی؟

امراؤ۔ پاسی۔

رسوا۔ اچھا تو وہ قصہ تو رہ گیا۔ چھٹن نے چونی دی یا نہیں۔

امراؤ۔ میری جانے بلا۔ چھٹن کے جانے کے بعد میں نے منہ ہی منہ میں موئی کو خوب کہا۔ پیسے چھین کے چوک میں اچھال دیئے۔

میرے کمرے کے برابر ایک اور چھوٹا سا کمرا تھا۔ کوئی دو روپے مہینے کرائے کا۔ اس میں ایک رنڈی آکے رہی تھی حسنا۔ ابھی جوان تھی۔ اس کی اور آبادی کی پرگت خوب ملی۔ دن بھر وہیں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ ساری خصلتیں حسنا کی اس نے اختیار کر لیں۔ جیسی وہ رنڈی تھی ویسے ہی اس کے آشنا۔ ایک آیا، پاؤ بھر پوریاں تیل کی لئے چلا آتا ہے۔ دوسرا پچاس آم دو آنے سینکڑہ کے لیتا آیا۔ کسی سے دو گز نینو کی فرمائش ہے۔ مخملی بوٹ کا چونکا ہے۔ میلے تماشے میں دو چار گرگے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے صافے بندھے ہوئے۔ کف دار کرتے یا انگرکھے کمر کے پاس سے چست۔ کوئی دھوتی باندھے ہے، کوئی چست گھٹنا ڈاٹتے ہے۔ ہاتھ میں لٹھ ہے، گلے میں ہار پڑے ہوئے۔ بی حسنا ٹھمک ٹھمک ان کے ساتھ چل رہی ہیں۔ برن والی سرا میں جا کے ایک بوتل ٹھرے کی آڑی۔ وہاں سے چلے تو جھومتے جھامتے، لڑکھڑاتے، ناچتے، گاتے۔ بی حسنا بھی اس کی بغل میں تھیں ابھی اس کے گلے میں ہاتھ۔ سر راہ گالم گلوچ، نوچم کھسوٹ، جوتم جاتا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں دو ایک تو رستے میں گر پڑے، تین چار میلے تک پہنچے۔ وہاں چرس پر دم پڑے۔ ان میں سے جو کوئی ہوشیار ہوا اس نے بی حسنا کو گانٹھ لیا، اور یاروں کی دھتا بتائی۔ اپنے گھر لے گیا یا انہی کے کمرے پر آکے ٹھہرا۔ اور یار جب میلے سے پلٹ کے آئے، کمرے کے نیچے کھڑے چیخ رہے ہیں، گالیاں دے رہے ہیں، ڈھیلے مار رہے ہیں۔ بی حسنا اول تو کمرے میں نہیں اور ہیں بھی تو بولیں کیوں۔ اتنے میں کوئی برق انداز چلا

آیا۔ اس نے مجمع خلاف قانون کو برہم کیا، سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

بس یہی انداز آبادی بھی چاہتی تھی۔ بھلا میں اس کی کب روادار ہوتی۔ آخر حسین علی (میرے پاس ایک نواب صاحب آیا کرتے تھے، ان کے خدمت گار کا نام تھا) کے ساتھ نکل گئیں۔ اس کے گھر جا کے بیٹھیں۔ وہاں اس کی جورو نے قیامت برپا کی، گھر سے نکل گئی۔ میاں حسین علی ان پر لٹو تھے۔ بیوی کے نکل جانے کی انہیں پرواہ نہ ہوئی، مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ اب کھانا کون پکا دے۔ بی آبادی کو چولہا پھونکنا پڑا۔ یہ اس کی کب عادی تھیں۔ بہر طور چند روز یوں گزرے۔ یہیں ایک بچہ جنیں۔ خدا جانے حسین علی کا تھا یا کسی اور کا۔ دو مہینے کا ہو کے وہ بچہ جاتا رہا۔ ادھر حسین علی کی جورو نے روٹی کپڑے کا دعویٰ کیا۔ ڈیڑھ روپے مہینے کی ڈگری ہو گئی۔ تین روپے نواب دیتے تھے۔ ڈیڑھ روپے میں کیا ہوتا۔ اوپر کی آمدنی پر بسر تھی۔ اس میں بھی کچھ نہ چلی۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں۔ آخر میاں حسین علی کے گھر سے نکل کے محلے کے ایک لڑکے منے کے ساتھ بھاگیں۔ اس لڑکے کی ماں پٹھانی، کتنی بڑی مشہوروں میں تھی۔ جہاں دو چار لفنڈریاں اور رہتی تھیں وہیں ان کا بھی ٹھکانا ہو گیا۔ بی پٹھانی کی روزی میں کسی قدر وسعت ہوئی۔ منے برائے نام رہ گئے۔ میاں منے کے ایک پیر بھائی میاں سعادت، پٹھانی کو جل دے کے انہیں وہاں سے لے اڑے۔ یہ اپنی ماں کے پاس لے گئے۔ ان کی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان کے پاس ایک تکیہ تھا۔ وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں۔ بی آبادی ان کی حفاظت پر متعین ہوئیں۔ میاں سعادت کسی کارخانے میں کام کرتے تھے۔ دن بھر وہاں چلے جاتے تھے۔ یہ مرغیاں ہنکایا کرتی تھیں۔ وہاں انہوں نے محمد بخش گلو کنجڑن کے بیٹے سے راہ و رسم پیدا کی۔ بلکہ سعادت کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا۔ بیٹے سے کہا۔ اس نے خوب جوتے مارے۔ میاں محمد بخش کے ایک اور یار تھے میاں امیر۔ نواب امیر مرزا کے خدمت گاروں میں نوکر تھے۔ یہ فن تماش بینی میں طاق تھے، اڑا لے گئے۔ انہوں نے ایک مکان میں لے جا کے رکھا۔ یہاں اور یاروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔ بی آبادی سب کی دل جوئی میں مصروف رہتیں۔ اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی برکت سے خوب پھلیں پھولیں۔ اب میاں امیر کے کس کام کی تھیں۔ اس نے اٹھا کے اسپتال میں پھنکوا دیا۔ بالفعل وہیں تشریف رکھتی ہیں۔ اگر آپ فرمایئے تو بلوا دی جائیں۔

رسوا۔ مجھے معاف ہی کیجئے۔

(3)

ہاتھ آئی مراد منہ مانگی
دل نے پائی مراد منہ مانگی

رجب کی نوچندی تھی۔ کچھ بیٹھے بیٹھے میرے دل میں آئی، چلو درگاہ چلیں، زیارت ہی کریں۔ سرشام سوار ہو کے پہنچے۔ بڑا مجمع تھا۔ پہلے تو مردانی درگاہ کے صحن میں ادھرادھر ٹہلا کی۔ پھر جا کے شمعیں جلائیں، حاضری چڑھائی۔ ایک صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے، انہیں سنا۔ پھر ایک مولوی صاحب آئے۔ انہوں نے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد ماتم ہوا۔ اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ میں نے بھی زیارت رخصتی پڑھ کے واپسی کا ارادہ کیا۔ دروازے تک پہنچ کے جی میں آیا زنانی درگاہ میں بھی ہوتی چلوں۔ نوحہ خوانی کی شہرت اور نواب ملکہ کشور کی سرکار سے توسل کی وجہ سے اکثر عورتیں مجھ کو جانتی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ دوچار مل ہی جائیں گی۔ اسی بہانے سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔ سوار ہو کے چوپہلے پر پردہ ڈال کے زنانی درگاہ کے دروازے پر پہنچی۔ محل دار نے آکر سواری اتروائی۔ اندر گئی۔ میرا خیال غلط نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔ شکوے، شکایتیں، غدر کے حالات، ادھرادھر کی باتیں ہوا کیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں واپس آنے ہی کو تھی کہ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں، دہنی طرف کی صحنچی سے کان پور والی بیگم صاحب نکلی چلی آتی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ ہیں، تولواں جوڑا پہنے ہوئے، چار پانچ مہریاں ساتھ ہیں۔ ایک پانچے سنبھالے ہوئے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھیا ہے، ایک لوٹیا خاص دان لئے ہے، ایک کے پاس سینی میں تبرکات ہیں۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے۔

بیگم:۔ اللہ امراؤ! تم تو بڑی بے مروت ہو۔ کان پور سے جو غائب ہوئیں تو آج ملی ہو، وہ بھی اتفاق سے۔

میں:۔ کیا کہوں۔ جس دن آپ کے باغ میں رات کو رہی تھی، اسی دن صبح کو لکھنؤ سے لوگ آ کے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے۔ پھر بھاگڑ ہوئی۔ خدا جانے کہاں کہاں ماری ماری پھری۔ نہ مجھے آپ کا پتا تھا نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بیگم:۔ خیر اب تو ہم تم دونوں لکھنؤ میں ہیں۔

میں:۔ لکھنؤ کیسا، اس وقت تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بیگم:۔ اس کی سند نہیں۔ تمہیں میرے مکان پر آنا ہو گا۔

میں:۔ سر آنکھوں سے۔ مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟

بیگم:۔ چوپٹیوں پر۔ نواب صاحب کو کون نہیں جانتا۔ پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب اتنے میں ایک مہری بول اٹھی "نواب محمد تقی خاں کا مکان کون نہیں جانتا۔"

میں:۔ آنے کو تو آؤں مگر نواب صاحب کے خلاف نہ ہو۔

بیگم:۔ نہیں۔ وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں۔ اور پھر تمہارے واسطے؟ میں نے اس رات کا حال رتی رتی ان سے کہا تھا۔ انہوں نے خود تمہیں کان پور میں کئی دفعہ ڈھونڈوایا۔ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

میں:۔ اچھا تو ضرور آؤں گی۔

بیگم:۔ کب آؤ گی؟ وعدہ کرو۔

میں:۔ اب کی جمعرات کو حاضر ہوں گی۔

بیگم:۔ اوئی۔ یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہو گئیں۔ ابھی تو پورے آٹھ دن ہیں۔ ادھر ہی کیوں نہیں آتیں؟

میں:۔ اچھا تو اگلی پیر کو آؤں گی۔

بیگم:۔ اتوار کو آؤ۔ نواب بھی گھر میں ہوں گے۔ پیر کے دن شاید کسی انگریز سے ملنے چلے جائیں۔

میں:۔ مناسب ہے، اتوار ہی کو سہی۔

بیگم:۔ کس وقت آؤ گی؟

میں:۔ جس وقت کہیے۔ مجھے گھر پر کوئی کام نہیں، ہر وقت برابر ہے۔

بیگم:۔ تم کہاں رہتی ہو؟

میں:۔ چوک میں سید حسن خاں کے پھاٹک کے پاس۔

بیگم:۔ اچھا تو میں مہری کو بھیج دوں گی۔ اسی کے ساتھ چلی آنا۔

میں:۔ یہ بہت اچھا ہے۔

بیگم:۔ اچھا تو خدا حافظ!

میں:۔ خدا حافظ! ہاں تو کہیے، صاحب زادہ کیسا ہے؟

بیگم:۔ نبن؟ ماشاء اللہ اچھا ہے۔ لو اب تم نے یاد کیا۔

میں۔ کیا کہوں، باتوں میں کیسی بھولی۔ اور بھولی کیا، جب چاہتی تھی پوچھوں ایک نہ ایک بات نکل آتی تھی۔

بیگم۔ اب تو سلامتی سے ذرا ہوش سنبھلا ہے۔ اچھا اس دن اسے بھی دیکھ لینا۔

میں۔ رات کی نیند حرام۔ لے اب کچھ نہ کہیئے۔ خدا حافظ!

بیگم۔ خدا حافظ۔ دیکھو ضرور آنا۔

میں۔ ایسی بات ہے؟

اتنے میں مہری نے دیکھا کہ باتوں کا سلسلہ پھر چلا، کہنے لگی "بیگم صاحب! چلیئے، دیر سے سواری لگی ہے۔ کہار موئے چلا رہے ہیں۔"

(4)

ہر چند بہت غور کیا ہم نے شب و روز
دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

میں خانم سے علیحدہ ہو گئی تھی، مگر جب تک وہ جیتی رہیں انہیں اپنا سرپرست سمجھا کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت تھی۔ ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہو گئی تھی۔ سن جو زیادہ ہو گیا تھا تو دنیا کی طرف سے ان کی طبیعت پھر گئی تھی۔ اب ان کو کسی کی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا، مگر محبت اسی طرح کرتی تھیں۔ وہ اپنے جیتے جی کسی نوچی کو اپنے ساتھ سے جدا نہ سمجھتی تھیں، مجھ سے تو ان کو خاص محبت تھی۔ بسم اللہ نے ان کو بہت آزار دیئے، اس لئے اس سے انہیں نفرت سی ہو گئی تھی۔ لیکن پھر اولاد تھی۔ خورشید جان بھی غدر کے بعد آ گئی تھیں۔ وہ خانم کے پاس رہتی تھیں۔ امیر جان نے علیحدہ کمرا لے لیا تھا، مگر وہ بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمرا خانم نے مجھے دیا تھا وہ ان کی زندگی بھر مجھ سے خالی نہیں کرایا گیا۔ میرا اسباب اس میں بند رہتا تھا۔ میرا قفل لگا تھا۔ جب جی چاہتا تھا دو دو تین تین دن وہیں جا کے رہتی۔ سال بھر کہیں رہوں، مگر محرم میں تعزیہ داری وہیں کرتی تھی۔ میرے نام کا تعزیہ خانم مرتے دم تک رکھا کیں۔

جمعرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔ جمعے کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ علیل ہے،

تمہیں یاد کرتی ہیں۔ میں فوراً سوار ہو کے گئی۔ انہیں دیکھ کر گھر پر واپس آنے کا ارادہ تھا کہ جی میں آیا ایک بھاری جوڑا نکالتی چلوں۔ کمرا کھولا۔ دیکھا کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہوئے ہیں۔ پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے۔ فرش فروش الٹا پڑا ہے۔ ادھر ادھر کوڑا پڑا ہے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے اگلے دن یاد آئے۔ اللہ ایک وہ دن تھا کہ یہ کمرا ہر وقت کیسا سجا سجایا رہتا تھا۔ دن میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی۔ بچھونے جھاڑے جاتے تھے۔ گرد کا نام تک نہ تھا۔ تنکا تک کہیں پڑا نہ رہتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی، اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ آدمی ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ذرا جالے تو لے لے۔" وہ ایک سینٹھا کہیں سے ڈھونڈ کے اٹھا لایا۔ جالے لینے لگا۔ اتنی دیر میں میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی۔ آدمی نے اور میں نے مل کر دری بچھائی۔ چاندنی کو ٹھیک کیا۔ جب فرش درست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کے جھڑوائے۔ کوٹھری میں سے سنگار دان، پان دان، اگال دان اٹھا لائی۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں، جس طرح کسی زمانے میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی۔ آدمی کے پاس خاص دان تھا۔ پان لے کے کھایا۔ آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آگیا۔ شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اس زمانے کے قدر دانوں کا تصور بندھ گیا۔ گوہر مرزا کی شرارت، راشد کی حماقت، فیضو کی محبت، سلطان صاحب کی صورت، غرضیکہ جو جو صاحب اس کمرے میں آتے تھے، مع اپنے اپنے خصوصیات کے میرے پیش نظر تھے۔ وہ کمرا اس وقت فانوس خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ پھر دوسری سامنے آتی تھی۔ جب کل صورتیں نظر سے گزر گئیں تو یہ دور از سر نو پھر شروع ہوا۔ پھر وہی صورتیں ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں۔ پہلے تو ایسے دور جلد جلد ہوئے، اب ذرا توقف ہونے لگا۔ اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تردد و فکر کرنے کا موقع ملا۔ جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے، ان پر تفصیلی نظر پڑنے لگی۔ پہلے دماغ کو چکر ہوا تھا تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اب ہر تصویر سے بہت سی شکلیں اور فانوس خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجرے کا تمام جلسہ، جس میں سلطان صاحب کو دیکھا اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا، پھر انکا خود تشریف لانا، مزے مزے کی باتیں، شعر و سخن کا چرچا، خان صاحب کا مخل صحبت ہونا، بد زبانی کرنا، سلطان کا تمنچہ مارنا، خان صاحب کا گر پڑنا، شمشیر خاں کی جان نثاری، کوتوال کا آنا، خان صاحب کو

گھر پر بجوادینا۔ مگر پھر سلطان صاحب کا نہ آنا۔ محفل میں ان کو دیکھنا۔لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا۔ پھر از سرِنو رسم ہونا۔ نواز گنج کے جلسے، یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دورے برابر چل رہے تھے۔ مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کے آنا یاد آتا تھا تو طبیعت کچھ رک سی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقع پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ اتنے میں آدمی نے زور سے ایک چیخ ماری۔

آدمی:۔ بیوی! دیکھئے، وہ کنکھجورا آپ کے دوپٹے پر چڑھا جاتا ہے۔

میں ادہی کہہ کے اٹھی۔ جلدی سے دوپٹا اتار کے پھینک دیا۔ الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹا اتار کے جھاڑا۔ کنکھجورا پٹ سے گرا اور رینگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایہ اٹھایا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر بچھی ہوئی ہیں۔

آدمی:۔ (بہت ہی متعجب ہو کے) ہائیں! اے لیجئے، یہ کیا ہے!

میں:۔ (دل میں) اہاہا! اشرفیاں ہیں! (آدمی سے) اشرفیاں ہیں!

آدمی:۔ واہ! اشرفیاں یہاں کہاں سے آئیں؟

میں:۔ (ہنس کے) وہ کنکھجورا اشرفیاں بن گیا۔ اچھا اٹھالو۔

آدمی پہلے تو جھجکا، پھر پانچوں اشرفیاں مجھے حوالے کیں۔

رسوا:۔ تو کیا خانم کا مکان غدر میں نہیں لٹا؟

امراؤ:۔ لٹا کیوں نہیں۔ مگر فرض کر لیجئے کہ میرے پلنگ کا پایہ کسی نے اٹھا کے نہیں دیکھا۔

رسوا:۔ ممکن ہے۔

(5)

کسی طرح سے ہو تسکین شوق کیا رشک
ملیں گے آج ہم ان سے رقیب سے مل کے

اتوار کے دن 8 بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری نیئنس اور کہار لے کے سر پر سزاول ہو گئی۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح حقہ پینے بھی نہ پائی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں

سمجھتی تھی کھانا وانا کھا کے جانا ہو گا۔ مہری نے کہا۔ "بیگم صاحب نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا وہیں آ کے کھانا"۔ میں نے پوچھا "نواب صاحب گھر پر ہیں؟" اس نے کہا۔ "نہیں۔ صبح اٹھ کے گاؤں کو سدھارے ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "کب آئیں گے؟" مہری نے کہا۔ "اب آئیں تو کہیں شام کو آئیں۔" مجھے بیگم سے تخلئے میں بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اس لئے فوراً اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منہ دھو، کنگھی چوٹی کر، کپڑے پہن، ایک ماما کو ساتھ لے کے روانہ ہو گئی۔

جا کے جو دیکھا، بیگم صاحب منتظر بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ دسترخوان بچھا۔ میں نے اور بیگم صاحب نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت تکلف کا کھانا تھا۔ پراٹھے، قورمہ، کئی طرح کا سالن، بالائی، مہین چاولوں کا خشکہ، نورتن چٹنی، سیب کا مربہ، حلوہ سوہن، کھانا کھا کے چپکے سے میرے کان میں۔

بیگم:۔ کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی یاد ہیں؟

میں:۔ چپ بھی رہو۔ کہیں کوئی سن نہ لے۔

بیگم:۔ سن لے گا تو کیا ہو گا۔ کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا جنت نصیب کرے) نے مجھے نواب کے لئے مول لیا تھا۔

میں:۔ برائے خدا چپ رہو۔ کہیں علیحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔

کھانا کھا کے منہ ہاتھ دھویا، پان کھایا، مہری نے حقہ لا کے لگایا۔ بیگم نے سب کو بہانے سے ٹال دیا۔

میں:۔ بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔

بیگم:۔ جب تمہیں پہلے پہل کانپور میں دیکھا تھا اسی دن پہچان لیا تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک الجھن سی رہی تھی۔ دل میں کہتی تھی میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے؟ کیوں کر دیکھا ہے؟ یہ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف خیال دوڑاتی تھی، کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ اتنے میں کریمن مہری پر نظر پڑی۔ کریمن کے نام پر مونڈی کاٹے کریم کا نام یاد آگیا۔ دل نے کہا۔ اوہو! انہیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔

میں:۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ میری ساتھ والیوں میں خورشید ہے۔

اس کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی، تم یاد آجاتی تھیں۔

بیگم۔ اب میرا حال سنو۔

میں تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عمدۃ النساء بیگم صاحب کے ہاتھ بکی ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا میرا سن کوئی بارہ برس کا ہو گا۔ نواب کو سولہواں برس تھا۔ نواب کے ابا جان کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب سے ان سے نااتفاقی رہتی تھی۔ نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔ ان کا مکان دہلی میں تھا۔ بیگم صاحب کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ نواب کی شادی ان کے بھائی کی لڑکی کے ساتھ ہو۔ میاں بیوی میں پہلے ہی سے نااتفاقی تھی، اس بات سے اور ضدیں بڑھیں۔ ابھی یہ جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ نواب کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہیے، ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ استے میں میں پہنچ گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب نے انتقال کیا اور اس کے چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحب جائیداد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انہی کو ملی۔

نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے جن کی بدولت میں بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں اور چین کرتی ہوں۔ نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی بیوی کو چاہتا ہے۔ میری ظاہر میں تو کبھی کسی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یوں باہر اپنے دوستوں آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مرد ذات ہیں۔ کچھ ان کے پیچھے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزوئیں میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی، خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ ہے کہ خدا نبن کو پروان چڑھائے۔ بہو بیاہ لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں۔ پھر چاہے مر جاؤں۔ نواب کے ہاتھوں مٹی عزیز ہو جائے۔ اب تم اپنا حال کہو۔

جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی، مجھے اپنی قسمت پر افسوس آرہا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی، تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر، بکی بھی تو کہاں، رنڈی کے گھر میں۔ اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تخلیہ کی

باتیں ہو چکیں، نوکروں کو آواز دی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ یہ سب سامان منگایا۔ گانے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلی تھیں تو وہ رام دئی تھی اور میں امیرن۔ سب لوگوں کے سامنے وہ پھر بیگم صاحب ہو گئیں اور میں امراؤ جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجا لیتی تھیں۔ جب میں گا چکتی تھی تو ستار کی وہ کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا اس کو گوایا۔ سر شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

(6)

ہاں اے نگاہ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا۔ وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہو گئی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ سب چیزیں ہٹا دی گئیں۔ چھپنے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں۔ اور سب لوگ اپنے اپنے قرینے سے ہو گئے۔ میں بھی بیگم سے الگ ہٹ کر منقطع بن کے بیٹھ گئی۔ جس دالان میں ہم لوگ بیٹھے تھے، وہاں سے دروازے کا سامنا تھا۔ پردہ پڑا ہوا تھا۔ نواب کے انتظار میں اس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ استے میں کسی خدمت گار نے چلا کر کہا۔ "نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔" چند لمحے کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا۔ "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔" نواب اندر داخل ہوئے۔

میں (صورت دیکھتے ہی دل میں) وہی تو ہیں (سلطان صاحب) ہے ہے! کس موقع پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پہلے تو کچھ جھجکے، پھر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بھی انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں دیکھتا ہوں جو ان کی طرف تو حیرت سے
مری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں

اب نواب دالان کے قریب پہنچ گئے اور میری طرف دیکھتے جاتے تھے کہ۔

بیگم۔ ادئی نواب، دیکھتے کیا ہو؟ یہ وہی ہیں امراؤ جان جو کان پور.....

اب فرش کے قریب پہنچ گئے۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب مسند پر بیگم کے پہلو میں اک ذرا سرک کے بیٹھ گئے۔

اب شام ہو گئی تھی۔ مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے۔ بیگم پان بنانے لگیں۔ اس اثنا میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا۔ میں نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں، نہ میں بول سکتی ہوں۔ منہ سے بولنے کا تو موقع نہ تھا مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔ شکوے شکایت، رمز و کنایت، سب اشاروں میں ہوا۔

نواب۔ (کسی قدر اجنبیت سے) امراؤ جان صاحب! واقعی ہم تو آپ کے بہت ہی ممنون ہیں۔ واقعی کان پور میں اس شب کو تمہاری وجہ سے ہمارا گھر لٹنے سے بچ گیا۔

میں۔ یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ایک اتفاقی امر تھا۔

نواب۔ خیر وہ کچھ ہو، وجہ تمہاری تھی۔ خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک خیریت ہو گئی۔ تمام ضروری کاغذات کوٹھی میں موجود تھے۔

میں۔ یہ حضور ان دنوں جنگلے میں عورتوں کو چھوڑ کے کہاں گئے تھے؟

نواب۔ کیا کہوں، ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جائیداد بادشاہ نے ضبط کر لی تھی۔ لاٹ صاحب کے پاس کلکتے جانا ضرور تھا۔ ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا، نہ لیا، نہ دیا۔ صرف شمشیر خاں اور ایک آدمی اور ساتھ لے کے چلا گیا۔

میں۔ وہ کوٹھی ایسے جنگل میں ہے کہ جو واردات ہو تعجب ہے۔

نواب۔ سوائے اس واقعے کے اور کوئی واردات نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ غدر ہونے کو تھا۔ بدمعاشوں نے سر اٹھایا تھا۔ ملک میں اندھیر مچا ہوا تھا۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ پھر دسترخوان بچھا۔ سب نے ساتھ مل کے کھانا کھایا۔

جب حقہ پان سے فراغت ہو چکی، نواب نے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ وفا یاد آئی
یاد آئی تو جفا یاد آئی

ہجر کی رات گزر ہی جاتی
کیوں تری زلف رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے
موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شعر یاد نہیں۔ مقطع یہ ہے۔

کیا غزل کوئی کہی ہے .....
آج کیوں باد صبا یاد آئی

(7)

جھولا کن ڈارو رے امریاں

برسات کے دن ہیں۔ پانی جھما جھم برس رہا ہے۔ آموں کی فصل ہے۔ میرے کمرے میں مجمع ہے۔ بسم اللہ جان، امیر جان، بیگا جان، خورشید جان، رنڈیوں میں۔ نواب ہبن صاحب، نواب چھبن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، تفضل حسین، امجد علی، اکبر علی خاں، مردوں میں۔ یہ سب صاحب موجود ہیں، گانا ہو رہا ہے۔ اتنے میں۔

بسم اللہ جان۔ بھئی ہو گا۔ گانا تو روز ہوا کرتا ہے۔ اس وقت تو کڑھائی چڑھاؤ۔ کچھ پکوان پکواؤ۔ دیکھو کیسا مینہ برس رہا ہے۔

میں۔ او نہہ۔ بازار سے جو جی چاہے منگوا لو۔

خورشید۔ بازار سے منگوا لو، خوب کہی۔ اپنے ہاتھ سے پکانے میں مزا ہی اور ہے۔

امیر۔ بہن! تمہیں ہنڈیا گھونٹنے کا مزا ہے۔ ہم نے نہ تو کبھی پکایا ہے، نہ پکانے کی قدر

جانتے ہیں۔

بیگا۔ تو پھر وہی بازار کی ٹھہری۔

میں۔ اے ہے باجی کیا بھوکی ہو؟

بیگا۔ میں تو بھوکی نہیں ہوں۔ بسم اللہ سے پوچھو جس نے صلاح دی تھی۔

بسم اللہ۔ بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہیئے۔

میں۔ میں بتاؤں! چلو بخشی تالاب چلیں۔

بسم اللہ۔ ہاں بھئی کیا بات کہی ہے۔

خورشید۔ خوب سیر ہوگی۔

بیگا۔ ہم بھی چلیں گے۔

میں۔ اچھا تو سامان کرو۔

بات کرتے کرتے تین گاڑیاں کرایہ پر آگئیں۔ کھانے پکانے کا سامان گاڑیوں پر لدوا دیا گیا۔ دو چھولداریاں نواب ببن صاحب کے گھر سے آگئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔

گومتی پار پہنچ کے گانا شروع ہوا۔ اس دن بیگا جان کا گانا ۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں۔ دل پسا جاتا تھا۔

شہر سے نکل کے جنگل کا سماں قابل دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ برس رہا ہے۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے، ندیاں، جھیلیں بھری ہوئی ہیں۔ مور ناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے ہیں تالاب پر پہنچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا۔ چولہے بن گئے، کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھٹن صاحب بارانی پہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں چکا لائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چارپائیاں آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا۔ آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔

کوئی ادھر دوڑا جارہا ہے، کوئی ادھر۔ آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت، تھوڑی دیر میں پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے۔ پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے

مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی، جیسے باجی بیگا جان، وہ چھولداری میں بیٹھیں رہیں۔

بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منہ پر آم کا رس مل دیا۔ پھر ان کی چیخیں اور سب کا قہقہہ لگانا، دیکھنے کا تماشا تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بہتی بہاتی تین نٹنیاں آنکلیں۔ ان کو گوانا شروع کیا۔ ان کے ساتھ ڈھولکی والا غضب کی ڈھولکی بجاتا تھا۔ بھلا ان کا ناچ گانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا۔ مگر اس موسم میں اور ایسی جگہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا، دھوپ نکل آئی۔ ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے۔ جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے۔ سورج انہی گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا جھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی تھیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔ اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ خفقانی مزاج کی عورت، جیسی کہ میں ہوں، جلدی سے چھولداری میں چلی آتی۔ یہ تماشہ دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی۔ اس پر کچھ گنوار راستہ چل رہے تھے۔ کسی کے کندھے پر ہل تھا، کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لئے جاتی تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیڑوں بکریوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی کی اکیلی ہی رہ گئی۔ نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب اس سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک اب میں گویا تالاب کی طرف جا رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرے قدم جلد جلد اٹھ رہے ہیں۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں نکسو کی طرف چلی جا رہی ہوں۔ تالاب داہنے کو چھوٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی۔ ایک مینڑ میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور جا کر ایک نالہ ملا۔ نالے کے اس پار تھوڑے فاصلے پر دو تین درخت تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی باندھے، مرزئی پہنے، ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپٹا ہوا کھرپی ہاتھ میں لئے کچھ کھود رہا ہے۔ میری اس

شخص کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا، پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا۔ اب قریب یقین کے ہو گیا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ نظر پھیرلوں مگر نگاہ کم بخت اسی طرف لڑی رہی۔ اب تو بالکل یقین ہو گیا۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں، اور ضرور ہی گر پڑتی، اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سلار بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر دلاور خان نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ جس طرح میں اسے دیکھ رہی تھی، وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یقیناً مجھے اس نے نہ پہچانا ہو گا۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سلار بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سلار بخش میرے پاس پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ سلار بخش نے میرا حال دیکھ کے کہا۔ "ہائیں ڈر گئیں؟" میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ سلار بخش اس طرف دیکھنے لگا۔

سلار بخش۔ وہاں کیا دھرا ہے۔ ایک کھرپی پڑی ہے۔ واہ! اس سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا تھا۔

(منہ سے تو نہ بولا گیا، میں نے ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا)۔

سلار بخش۔ چلم پینے گیا ہو گا تکیئے پر۔ اچھا تو چلئے۔ نواب چھٹن صاحب بہت سی مرغابیاں شکار کر کے لائے ہیں۔ آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ میاں ادھر ڈھونڈنے گئے ہیں، میں ادھر آیا۔ یہ کہئے آپ مل گئیں۔ نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔ میں نے ہاں، نہ کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہو کے تالاب پر پہنچ گئے۔

رات کو یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے وانے سے فراغت ہو گئی، میں نے اکبر علی خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علی خاں۔ تم نے اچھی طرح دیکھا۔ یہ وہی دلاور علی خاں تھا؟ فیض آباد کا رہنے والا؟ اس کا تو حلیہ جاری ہے۔ افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بدمعاش کو چل کے گرفتار کرتے۔ بڑا نام ہوتا۔ سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے۔ اور یہ کھودتا کیا تھا؟

میں۔ کیا معلوم، موا اپنی قبر کھودتا ہو گا۔

اکبر علی خاں۔ اس کے نام سے تمہارے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمہارا کیا کر سکتا

ہے۔

میں۔ (دل کو ذرا تھام کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں کچھ وہاں گاڑ دیا ہو گا۔ اسے کھودنے آیا ہو گا۔

اکبر علی خاں۔ چلو دیکھیں۔

میں۔ میں تو نہ جاؤں گی۔

اکبر علی خاں۔ میں جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لئے جاتا ہوں۔

میں۔ کہاں جاؤ گے؟ اب وہاں کچھ نہ ہو گا؟ وہ کھود کے لے بھی گیا ہو گا۔

اکبر علی خاں۔ میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب چھٹن صاحب کی چھولداری تھی۔ وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب۔ خاں صاحب! کہاں جایئے گا؟

اکبر علی خاں۔ نواب صاحب! ابھی آپ نے آرام نہیں کیا؟

نواب۔ جی نہیں۔

اکبر علی خاں۔ میں حاضر ہوں؟

نواب۔ آیئے۔

اکبر علی خاں اور میں دونوں نواب کی چھولداری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔

نواب۔ (مجھ سے) اور تم اس بدمعاش کو کیا جانو؟

میں۔ (اپنی سرگزشت تو ان سے کیا کہتی) میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔

نواب۔ اخاہ! آپ بھی فیض آباد کی ہیں؟

اکبر علی خاں۔ مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہئے۔ ایسے میں یہیں کہیں ہے۔ عجب نہیں گرفتار ہو جائے۔

یہ کہہ کر سلار بخش کو آواز دی، قلم دان منگوایا۔ تھانہ قریب تھا، تھانے دار کو رقعہ لکھا۔ تھوڑی دیر میں تھانے دار صاحب مع دس بارہ سپاہیوں کے آموجود ہوئے۔ میں نے جو دیکھا ان سے کہہ دیا۔ گاؤں سے پاسی بلوائے گئے۔ پہلے اس موقع پر جا کے ڈھونڈا۔ تکیئے پر فقیر سے کسی قدر

سراغ ملا۔ ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے کی ملی۔ وہ تھانے دار کے پاس لے آیا۔

تھانے دار۔ خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہو۔

تھانے دار صاحب نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے خوب تگ و دو کی۔ آخر تین بجے رات کو مکا گنج میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے تالاب پر پہنچ گیا۔ تلاشی میں چوبیس اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ میں شناخت کے لئے بلائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے پہچانا۔ دس بجے چالان لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

رسوا۔ اچھا تو پھر اس کا حشر کیا ہوا۔ اس قصے کو جلدی ختم کیجئے۔

میں۔ ہوا کیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا پھانسی ہو گئی۔ داخل جہنم ہوا۔

اختتامیہ

نہ پوچھ نامہ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

مرزا رسوا صاحب! جب آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کے لئے دیا تھا، مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہتا تھا پرزے پرزے کر کے پھینک دوں۔ بار بار خیال آتا کہ زندگی میں کیا کم روسیاہی ہوئی کہ اس کا افسانہ بعد مرنے کے بھی باقی رہے کہ لوگ اس کو پڑھیں اور مجھ کو لعنت ملامت کریں۔ مگر مزاج کی تساہلی اور آپ کی محنت کے لحاظ نے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ میں حسب معمول کمرے میں تنہا تھی۔ مامائیں، خدمت گار سب نیچے کے مکان میں سو رہے تھے۔ میرے سرہانے لیمپ روشن تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک کروٹیں بدلا کی۔ چاہتی تھی سو جاؤں مگر کسی طرح نیند نہ آئی۔ آخر اٹھی، پان لگا کر کھایا۔ ماما کو پکارا، حقہ بھروایا، پھر پلنگ پر جا لیٹی۔ حقہ پینے لگی۔ جی میں آیا کوئی کتاب دیکھوں۔ بہت سے قصے کہانی کی کتابیں سرہانے الماری میں رکھی تھیں۔ ایک ایک کو اٹھا کے ورق الٹے پلٹے، مگر وہ سب کئی کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں۔ جی نہ لگا۔ بند کر کے رکھ دیں۔ آخر اسی مسودے پر ہاتھ پڑا۔ خفقان کی شدت تھی۔ سچ مچ میں نے اس کے چاک کرنے کا مصمم قصد کر لیا۔ چاک ہی کیا چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہے۔ "اچھا امراؤ بالفرض اسے تم نے پھاڑ کے پھینک دیا، جلا دیا، تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمام عمر کے واقعات، جو خدائے عادل و توانا کے حکم سے فرشتوں نے مفصل اور مشرح لکھے ہیں، انہیں کون مٹا سکتا ہے۔"

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ قریب تھا کہ مسودہ ہاتھ سے گر پڑے، مگر پھر میں نے اپنے تئیں سنبھالا۔ چاک کرنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا۔ جی چاہا جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ دوں۔ پھر ایک بارگی یوں ہی بلا قصد پڑھنا شروع کیا۔ پہلا صفحہ جب تمام ہو گیا ورق الٹا۔ دو چار سطریں اور پڑھیں۔ اس وقت مجھے اپنی سرگزشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جس قدر پڑھتی جاتی تھی، جی چاہتا تھا اور پڑھوں۔ اور قصوں کو پڑھنے میں مجھے ایسا لطف کبھی نہ آیا تھا، کیوں کہ ان کے پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں، درحقیقت کوئی اصل

نہیں۔ یہی خیال قصے کو بے مزا کر دیتا تھا۔ میری سوانح عمری میں جو امور آپ نے قلم بند کئے ہیں، وہ سب مجھ پر گزرے ہیں۔ اس وقت وہ سب گویا میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ ہر واقعہ اصلی حالت میں نظر آتا تھا اور اس سے طرح طرح کے اثر میرے دل و دماغ پر طاری ہوتے تھے، جس کا بیان بہت ہی دشوار ہے۔ اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو اس کو میری دیوانگی میں کوئی شک نہ رہتا۔ کبھی تو میں بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔ کبھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے۔ غرضیکہ عجیب و غریب کیفیت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا۔ "جا بجا بناتی جانا۔" یہاں اس کا ہوش کسے تھا۔ پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔ اب میں اٹھی، وضو کیا، نماز پڑھی۔ پھر تھوڑی دیر سو رہی۔ صبح کو کوئی آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھو کے پڑھنے لگی۔ بارے سر شام تک سارا مسودہ پڑھ چکی۔

تمام قصے میں وہ تقریر آپ کی مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی جہاں آپ نے نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کر کے ان کا فرق بتایا ہے۔ واقعی نیک بخت عورتوں کو جس قدر فخر ہو زیبا ہے، اور ہم ایسی بازاریوں کو ان کے اس فخر پر بہت ہی رشک کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بہت کچھ دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب وہی دلاور خاں کی شرارت تھی۔ نہ وہ مجھے اٹھا لاتا اور نہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی، نہ میرا یہ لکھا پورا ہوتا۔ جن امور کی برائی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اور اسی لئے ایک مدت ہوئی کہ میں ان سے بیزار اور تائب ہوں، اس زمانے میں ان کی حقیقت مجھے کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ نہ ایسا کوئی قانون مجھے بتایا گیا تھا کہ میں ان سے اجتناب کرتی، اور اگر ایسا نہ کرتی تو مجھے سزا دی جاتی۔ میں خانم کو اپنا مالک اور حاکم تصور کرتی تھی، ان سے بہت ڈرتی تھی اور حتی الامکان ایسا کوئی کام نہ کرتی تھی جو ان کی مرضی کے خلاف ہو۔ اور اگر کرتی بھی تو بہت چھپا کے، تاکہ ان کی مار اور جھڑکیوں سے بچ سکوں۔ اگرچہ خانم نے مجھے زندگی بھر پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی، مگر خوف غالب تھا۔

جن لوگوں میں میں نے پرورش پائی تھی، جو ان کا طریقہ تھا وہی میرا بھی تھا۔ میں نے اس زمانے میں کبھی کسی مذہبی عقیدے پر غور نہیں کیا اور میرا خیال ہے کوئی ایسی حالت میں نہ کرتا۔

ارضی و سماوی حادثے جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، مگر جب واقع ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے۔ مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا یا زلزلے کا آنا، سورج گہن یا چاند گہن، قحط سالی، وبا وغیرہ ایسے امور اکثر خدائی غضب کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے وہ رفع دفع ہو گئیں، مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں دعا، تعویذ، ٹونکے کسی بات سے نہ ٹلیں۔ ایسے امور کو لوگ خدا کی

مرضی، تقدیر آسمانی کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہنچے تھے اور نہ ثواب عذاب کا مسئلہ اچھی طرح سمجھایا گیا تھا۔ اس لئے ان باتوں کا اثر میرے دل پر نہ تھا۔ بے شک اس زمانے میں میرا کوئی مذہب نہ تھا۔ صرف جو اور لوگوں کو کرتے دیکھتی تھی وہی آپ بھی کرنے لگتی تھی۔ اس وقت میں میرا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ تقدیر پر میں بہت ہی شاکر تھی۔ جو کام میں کاہلی سے نہ کر سکتی تھی یا میری بے وقوفی سے بگڑ جاتا تھا، اس کو تقدیر کے حوالے کر دیتی۔ فارسی کتابوں کے پڑھنے سے آسمان کی شکایت کرنے کا مضمون میرے ہاتھ آگیا تھا۔ جب میرا کوئی مطلب فوت ہو جاتا تھا یا کسی اور وجہ سے مجھے ملال پہنچتا تھا تو جا و بے جا فلک کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔

ہم بھی ہیں مختار لیکن اس قدر ہے اختیار
جب ہوئے مجبور قسمت کو برا کہنے لگے

مولوی صاحب، بوا حسینی اور بڈھے بڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زمانے سے بہت ہی اچھا تھا۔ اس لئے ان کی طرح میں بھی اس زمانے کی غائبانہ تعریف اور زمانہ موجودہ کی بلا وجہ مذمت کیا کرتی تھی۔ میں کم بخت اس بات کو نہ سمجھی کہ بڈھے بڑھیاں، جو اگلے وقتوں کی تعریف کرتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اس لئے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خود زندہ جہان زندہ۔ خود مردہ جہان مردہ۔ سن رسیدہ لوگوں کے دیکھا دیکھی جوانوں نے بھی انہی کا وطیرہ اختیار کر لیا ہے اور چونکہ یہ غلط فہمی ایک مدت سے چلی آتی ہے اس لئے اب عموماً سب کو اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔

جوان ہونے کے بعد میں عیش و آرام میں پڑ گئی تھی۔ اس زمانے میں گا بجا کے مردوں کو رجھانا میرا خاص پیشہ تھا۔ اس میں ہم مقابلہ اور ساتھ والیوں کے جس قدر کامیابی یا ناکامی مجھ کو ہوتی تھی، وہی میری خوشی اور رنج کا اندازہ تھا۔ میری صورت بہ نسبت اوروں کے کچھ اچھی نہ تھی، مگر فن موسیقی کی مہارت اور شعر و سخن کی قابلیت کی وجہ سے میں سب سے بڑھی چڑھی رہی۔ اپنی ہم پیشہ عورتوں میں مجھے ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ مگر اس سے کچھ نقصان بھی ہوا۔ وہ یہ کہ جس قدر میری شہرت زیادہ ہوتی گئی، اتنا ہی خودداری کا خیال دل میں پیدا ہوتا گیا۔ جہاں اور رنڈیاں بے باکیوں سے اپنا مطلب نکال لیتی تھیں، میں منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ مثلاً ان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے کسی نہ کسی قسم کی فرمائش ضرور کر دینی چاہیئے۔ مجھے اس سے شرم آتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو انکار کر دے تو خفت ہو گی۔ اور نہ ہر شخص سے میں بہت جلد بے تکلف ہو جاتی تھی۔ میری اور ساتھ والیوں کے پاس جب کوئی آ کے بیٹھتا تو ان سب کو زیادہ فکر اس کی ہوتی کہ یہ کہاں تک دے

سکتا ہے اور ہم کہاں تک اس سے لے سکتے ہیں۔ میرا بہت سا وقت اس شخص کی ذاتی لیاقت، حسن اخلاق کے اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں معیوب سمجھنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ اور باتیں بھی مجھ میں رنڈی پنے کی نہ تھیں۔ اس لئے میری ساتھ والیوں میں سے کوئی مجھے ناک چوٹی گرفتار، کوئی خفقانی، کوئی بیوقوف، کوئی دیوانی سمجھتی تھی۔ مگر میں نے اپنی کی، کسی کی نہ سنی۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیشے کو عیب سمجھنے لگی اور اس سے دست بردار ہو گئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ مجرے پر بسر اوقات رہ گئی۔ یا کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی، رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔

جب ان افعال سے تائب ہوئی جن کو میں نے اپنے نزدیک برا سمجھ لیا تھا تو اکثر میرے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر پڑ جاؤں۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے "آخر رنڈی تھی نہ کفن کا چونگا کیا۔" مرزا صاحب! شاید اس محاورے کو آپ نہ سمجھیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب کوئی رنڈی سن سے اتر کر کسی کے گھر بیٹھ جاتی ہے تو تجربہ کار تماش بین اس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اس رنڈی نے "کفن کا چونگا کیا" یا "مرتے مرتے کفن لے مری۔" یعنی اپنے دام بچائے اور از راہ فریب تماش بین پر اپنی تجہیز و تکفین کا بار ڈالا۔ اس مثل سے رنڈیوں کی بے حد خود غرضی اور لالچ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میں سچ مچ تائب ہو گئی اور اب انتہا کی نیک ہوں، مگر اس کو سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے۔ کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر اس حالت میں کسی کی محبت کروں اور اس نسبت کی بنا سراسر خلوص اور نیک نیتی پر ہو، اس پر بھی خاص وہ شخص اور اس کے سوا جو لوگ دیکھیں یا سنیں گے، کبھی یقین نہ لائیں گے۔ پھر میرا محبت کرنا ہی بے سود ہو گا۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ میرے پاس دولت ہے، اس لئے اکثر لوگ اس سن میں بھی میری خواہش کرتے ہیں اور طرح طرح کے فریب مجھ کو دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب میرے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں اگرچہ ان کا تعلق میں ایسی رنڈیوں سے رہ چکی ہوں جو بدرجہا مجھ سے بہتر ہیں۔ کوئی صاحب میرے کمال موسیقی پر غش ہیں، حالانکہ ان کے کان تال سم سے آشنا نہیں۔ کوئی میری شاعری کے مداح ہیں، جنہوں نے عمر بھر ایک مصرع موزوں کہنا تو کیسا، پڑھا بھی نہ ہو گا۔ ایک صاحب میری علمیت کے قائل ہیں۔ خود بھی پڑھے لکھے ہیں، مگر مجھ کو "مولانا بالفضل اولانا" سمجھتے ہیں۔ معمولی مسئلے روزہ نماز کے بھی مجھ ہی سے پوچھ لیا کرتے ہیں۔ گویا کہ آپ میرے مرید یا مقلد ہیں۔ ایک

میرے عاشق زار میری دولت اور کمال سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، صرف میری تندرستی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پر اللہ آمین، مجھے چھینک آئی اور ان کے سر میں درد ہونے لگا۔ مجھے درد سر ہوا اور ان کے دشمنوں کا دم نکلنے لگا۔ ایک بزرگ ناصح مشفق بنے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا کرتے ہیں۔ مجھ کو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی دس گیارہ برس کی لڑکی سے باتیں کرتا ہو۔

میں ایک گھاگ عورت ہوں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے۔ جو جس طرح بناتا ہے بن جاتی ہوں اور در حقیقت ان کو بناتی ہوں۔ خلوص کے ساتھ بھی ملنے والے دو ایک صاحب ہیں۔ بے غرض ملتے ہیں۔ ان کا مقصود صرف ایک مذاق خاص ہے۔ مثلاً شعر و سخن یا گانا بجانا یا صرف لطف گفتگو۔ نہ ان کو کوئی غرض مجھ سے ہے، نہ مجھے کوئی غرض ان سے ہے۔ ایسے لوگوں کو دل سے چاہتی ہوں اور یہ بے غرضی رفتہ رفتہ ایک غرض ہو گئی ہے کہ نہ مجھے بغیر ان کے چین آتا ہے اور نہ انہیں بغیر میرے۔ مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں بٹھانے کا امیدوار نہیں ہے۔ کاش کہ ایسا ہوتا۔ مگر یہ تمنا ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کاش کہ جوانی پھر آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لئے برا ہے، خصوصاً عورت کے لئے، مگر رنڈی کے لئے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیرنیاں جو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں پڑی پھرتی ہیں، اگر غور کیجئے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں نکلیں گی، اور رنڈیاں بھی کون سی جو کبھی زمین پر پیر نہ رکھتی تھیں۔ قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ہزاروں بھرے پرے گھر تباہ کر دیئے، سینکڑوں جوانوں کو بے گناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اب کوئی ان کو آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ پہلے جہاں بیٹھ جاتی تھیں لوگ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اب کوئی کھڑے ہونے کا روادار بھی نہیں۔ پہلے بن مانگے موتی ملتے تھے، اب مانگے بھیک نہیں ملتی۔

ان میں اکثر اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث ہوئیں۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور رنڈیوں میں تھیں۔ جوانی میں ہزاروں روپے کمائے۔ ذرا مزے دار جھوڑا تھا۔ جب سن سے اتریں، وہی کمائی یاروں کو کھلانا شروع کی۔ بڑھاپے میں ایک نوجوان کے گھر بیٹھیں۔ اس کی جورو خوبصورت، کم سن، بھلا وہ ان پر کیوں ریجھتا۔ پہلے تو بیوی ذرا بگڑیں، مگر جب میاں نے اصل مطلب سمجھا دیا، خاموش ہو رہیں۔ ان کی خاطریں ہونے لگیں۔ جب تک مال رہا خوب میاں بیوی دونوں نے پھسلا پھسلا کے کھایا آخر کھکھ ہو گئیں۔ اب کون پوچھتا

تھا۔ نکال باہر کیا۔ گلیوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

بعض بے وقوف رنڈیوں نے کسی لڑکی کو لے کے پالا۔ اس سے دل لگایا۔ اس حالت میں میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں۔ مگر جب وہ جوان ہوئی، لے دے کے کسی کے ساتھ نکل گئی۔ یا اگر رہی تو کل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضے کیا۔ ان کو گھر کا انتظام یا ماما گیری کرنے کو رکھ لیا۔

آبادی نے بھی مجھے جل دیا ہوتا۔ مگر وہ تو کہو اس کے کرتوت پہلے ہی کھل گئے، نہیں تو مجھے لوٹ ہی لے جاتی۔ مرد کیا اور عورت کیا، رنڈی کی قوم میں بدکاروں کی زندگی کا اصول ہی ایسا بگڑا بنا ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں محبت نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی سمجھ دار مرد ہی ان کو دل دے سکتا ہے، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی اور نہ ہی عورت ایسی محبت کر سکتی ہے۔ نوچیاں اپنے دل میں یہ سمجھتی ہیں کہ جاتے ہم ہیں، پھر ان کو کیوں دیں۔

اگلے قدردان مرد زوال حسن کے بعد کنارا کرتے ہیں۔ یہ اس کی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں۔ بھلا اب کوئی خوشامد کیوں کرنے لگا۔ غرض کہ مردان سے کنارا کش اور یہ مردوں کی شاکی رہتی ہیں۔

پہلے پہلے میں بھی اور رنڈیوں کی زبانی مردوں کی بے وفائی کا دکھڑا اس کے وقت ضائع کرتی تھی اور بے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتی تھی، مگر باوجود اس کے کہ گوہر مرزا نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ سب آپ کو معلوم ہے، اور نواب صاحب جنہوں نے مجھ پر نکاح کا الزام لگایا تھا، اس کو بھی آپ سن چکے، پھر بھی میں مردوں کو بے وفا نہیں کہہ سکتی۔ اس معاملے میں عورتیں، خصوصاً بازار والیاں، ان سے کسی طرح کم نہیں۔ محبت کے باب میں مرد (معاف کیجئے) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد سچے دل سے اظہار عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں۔ اس لئے کہ مرد جس حالت میں اظہار عشق کرتے ہیں وہ حالت ان کی اضطراری ہوتی ہے، اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں، کیوں کہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسن ظاہری پر فریفتہ ہو کر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لئے مردوں کی محبت کسی قدر سریع الزوال اور عورتوں کی محبت عسیر الزوال ہوتی ہے۔ مگر جانبین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے، بشرطیکہ دونوں، یا کم از کم ایک، کو سمجھ ہو۔ واقعی مرد اس باب میں سریع الاعتقاد ہوتے ہیں اور عورتیں انتہا کی شکی۔ مرد پر عورت کا جادو بہت جلد چل جاتا ہے مگر عورت پر حب کا عمل مشکل سے کارگر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نقص فطرت کی طرف سے ہے، اس لئے کہ عورتیں ضعیف القویٰ ہیں اس لئے ان کو بعض وصف

ایسے دیئے گئے ہیں جن سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ من جملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے، بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک وصف ہے اس کی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے۔ اکثر ضعیف جانوروں میں بھی حیلہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ میں اس کی قائل نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے نہ عورت، بلکہ ہر ایک کو ایسا حسن عنایت ہوا ہے، جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں تو مرد عورت جس کا ناک نقشہ اچھا ہوتا ہے، سب اسے پسند کرتے ہیں، مگر اصل قدردان مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا مرد ہے۔ ایک خوبصورت عورت دوسری عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبو نہ ہو، ایک بدصورت مرد بھی، خوبصورت سے خوبصورت عورت کی رائے میں خوشبودار پھول کی طرح دل پسند ہے، اگرچہ اس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں غلطی صرف ایک ہی طرف سے نہیں ہوتی، بلکہ دونوں اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے۔ جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں، اس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ اس مرد میں ایک حد تک پایا جاتا ہے، جو کسی مالدار عورت کے دامن دولت سے وابستہ ہے، یا جس کا سن بہت کم ہے۔ مگر کوئی سن رسیدہ عورت ان کو کیوں چاہنے لگی؟

اس میں شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے بہ نسبت بڈھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں، مگر اس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے، اس لئے وہ ہر حالت میں اپنے حامی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ وقت ضرورت اس کو خطرے سے بچا سکے۔ پس جوان سے بہ نسبت بڈھے کے اس کی زیادہ توقع ہو سکتی ہے، اور حسن و جمال اس خوبی کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دے دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذت حاصل کرنا دونوں غرضیں شامل ہیں۔

چونکہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہئے اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاؤ ہے، لہٰذا وہ اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ جو امور میں نے اس موقع پر بیان کئے ہیں اس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں کو ہوتا ہے، نہ عورتوں کو، تو میں اسے تسلیم کر لوں گی اور یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خمیر میں داخل ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ انہیں اس کا شعور بھی ہو۔ میں نے عمر بھر کے تجربے کے بعد یہ امور دریافت کئے ہیں اور

میرے ساتھ جو شخص اس پر غور کرے گا، وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ اکثر عورتیں اور ناخواندہ مرد بھی ایسی باتوں پر غور نہیں کرتے، اس لئے ان کو اپنے زمانہ زندگی میں بہت سی بک بک جھک جھک کرنا پڑتی ہے۔ میرے خیال میں مرد و عورت دونوں اپنے اپنے رتبے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہرگز ملال نہ ہو۔ بہت سی آفتیں ٹل جائیں اور بہت سی دقتیں دور ہو جائیں۔ مگر ایک مشکل ہے کہ جب کسی بات کی فہمائش کی جائے تو اکثر یہی جواب ملتا ہے۔ "اوہ جی! جو تقدیر میں ہو گا، ہو کے رہے گا۔" اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم جو چاہیں کریں ہمیں نہ روکو۔ ہمارے کئے کچھ نہیں ہوتا، یعنی ہماری بد کاریوں کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہو گا تقدیر سے ہو گا۔ یعنی جو نتیجہ نکلے گا، وہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے ہو گا۔ یہ لغو گفتگو اگلے زمانے میں کسی قدر بامعنی بھی تھی، کیوں کہ اس زمانے میں اتفاق سے گھڑی بھر میں کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا تھا۔ اس پر مجھے شاہی زمانے کی ایک نقل یاد آئی ہے۔

زمانہ شاہی میں انقلاب کا ثبوت اکثر ملتا رہتا تھا۔ لوگوں کی حالتوں میں دفعتاً تغیر ہو جایا کرتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ ایک سپاہی نہایت ہی شکستہ حال موتی محل کے پھاٹک کے پاس چبوترے پر پڑا سو رہا تھا۔ قضائے کار نماز صبح کے بعد بادشاہ ٹہلتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ اتفاقاً اس وقت کوئی ساتھ نہ تھا۔ معلوم نہیں کیا جی میں آیا، آپ نے اسے جگا دیا۔ وہ سپاہی یوں ہی نیند سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ جہاں پناہ پر نگاہ پڑی۔ پہلے تو گھبرا گیا، پھر ایک ہی مرتبہ سنبھل کے اپنی حالت کو دیکھا۔ فوراً تلوار نذر کی۔ بادشاہ نے نذر قبول کی۔ زنگ آلودہ تلوار تھی۔ میان سے بہ دقت نکلی۔ پھر دیکھ بھال کر اس تلوار کی تعریف کی اور میان میں کر کے اپنی کمر میں لگائی۔ خود جو ولایتی باندھے ہوئے تھے، جس کا طلائی قبضہ تھا، معہ کمر بند مرصع اس کے حوالے کی۔ اس موقع پر حضور عالم (خطاب علی نقی خاں وزیر اودھ) آ گئے۔ جہاں پناہ نے اس جوان اور اس کی تلوار کی تعریف کی۔

بادشاہ:۔ دیکھنا بھئی کیا سجیلا جوان ہے اور تلوار بھی اس کے پاس کیا ہی عمدہ تھی۔ (کمر سے نکال کر) یہ دیکھو۔

وزیر:۔ قبلہ عالم! سبحان اللہ! مگر حضور سا جوہر شناس اور قدردان بھی تو ہو، جب ایسے لوگ اور ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

بادشاہ:۔ مگر دیکھنا بھئی، میری تلوار کچھ ایسی بد زیب نہیں ہے۔

وزیر:۔ ظل سبحانی کی تلوار اور بد زیب!

بادشاہ:۔ مگر لباس اس کے مناسب نہیں۔